دادر پل کے بچے

کرشن چندر

دادَر پُل کے بچّے

کرشن چندر کی دیگر کتب

۱- ایک گدھے کی سرگذشت
۲- پھول کی تنہائی
۳- دادر پل کے بچّے
۴- نئے غلام
۵- مضامین کرشن چندر
۶- کرشن چندر کے ڈرامے
۷- محبت کی رات
۸- پہلگام کا بدنام
۹- پرانے خدا
۱۰- فلمی قاعدہ
۱۱- الٹا درخت

دادر پُل کے بچّے

کرشن چندر

مکتبہ اُردو ادب
بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ لاہور

دادر پُل کے بچے

ایک روز کا ذکر ہے میں دو دن کا بھوکا اپنی فاقہ مست زندگی سے جھلّایا ہوا پریشان حال کولی واڑہ چال کی ایک تاریک کھولی میں بیٹھا ہوا اپنی پھٹی بنیائن سے جوئیں چن رہا تھا کہ بھگوان میری کھولی میں داخل ہوئے۔

بولے۔ "میں تمھارے شہر کے بچّوں کو دیکھنا چاہتا ہوں"۔

میں نے جھلّا کر کہا۔ "جاؤ جاؤ، میرے پاس ٹائم نہیں ہے"۔

بھگوان نے کہا۔ "اگر تم میرے ساتھ چلو گے تو میں تمھیں نکرّڈ کے ریستوران سے دو سلائس، ایک انڈے کا آملیٹ اور ایک

سنگل چائے پیش کروں گا۔"

"سچ بولتے ہو؟ کہ خالی پیلی بوم مارتے ہو؟"

میں نے بے چین نگاہوں سے بھگوان کو تاکتے ہوئے پوچھا۔

بھگوان نے جیب سے دس کا ایک نوٹ نکالا اور اُسے میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ "تو پہلے کیوں نہیں بولا؟"

میں نے ترش رو ہو کر کہا۔ "ہمارا ٹائم کھوٹی کیا۔ اور بمبئی میں کوئی کام پھوکٹ میں نہیں ہوتا۔"

ایرانی رستوران میں جاکر میں نے بیرے کو بولا

"دیکھو صاحب جو مانگیں ان کو دو۔ مگر مجھ کو چار سلائس دو انڈے کا آملیٹ اور ایک ڈبل چائے فوراً دو!"

بھگوان نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "مگر میں نے تو صرف دو سلائس، ایک انڈے کا آملیٹ اور ایک سنگل چائے کا وعدہ کیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "تم نے سورگ رستوران کو ذہن میں رکھ کر

آرڈر دیا ہوگا۔ مگر یہ سورگ نہیں ہے، یہ بمبئی ہے۔ یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ہے۔ شاید تم نے کبھی بمبئی کی سلائس نہیں دیکھا۔ اتنا مہین۔ پتلا اور باریک کٹا ہوا ہوتا ہے کہ تم اس کے آر پار دیکھ سکتے ہو بلکہ تھوڑا سا مکھن لگا کر اس سے شیو بھی کر سکتے ہو۔ اور انڈے؟ —— بمبئی کی مرغی کے انڈے اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ آملیٹ کو خوردبین کی مدد سے کھانا پڑتا ہے!! رہا سنگل چائے کا کپ؟ یہ کپ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ ایک آنسو بھی اس میں مشکل سے سما سکتا ہے!!"

مگر بھگوان میری بات نہیں مانے۔ اور میں ان کی بات نہیں مانا۔ دس منٹ تک ہم دونوں جھگڑتے رہے، آخر جب رستوران کے مالک نے پولیس کو بلانے کی دھمکی دی تو یکایک بھگوان مان گئے اور انھوں نے فوراً میرے لئے چار سلائس، دو انڈے کا آملیٹ اور ڈبل چائے کا آرڈر دے دیا۔ اور اپنے لئے اسپرو کی ایک ٹکیہ منگالی۔

میں نے کہا "تم نے خواہ مخواہ لفڑا کیا، اگر تم پہلے ہی میری

بات مات جاتے تو اس وقت اسپر دکھانے کی ضرورت نہ پڑتی !"
بھگوان نے شرمندہ ہو کر کہا۔ "بھئی آج کل فارن اکسچینج کی بڑی دقّت ہے۔ سورگ سے بمبئی آنے کے لئے مجھے صرف سو روپے ملے ہیں اور جانے کتنے روز مجھے یہاں رہنا پڑتا ہے اس لئے ایک ایک پائی پر نظر رکھنا پڑتی ہے۔"

"اماں ہٹاؤ بھی !" میں نے جل کر کہا۔ "تمہیں فارن اکسچینج کی کیا دقت ہو گی۔ یہ سب مصیبت تو ہم غریبوں کے لئے ہے۔ جب ہمارے دیس کے ایک معمولی کارخانے کے مالک کو فارن اکسچینج کی کوئی دقت نہیں ہوتی۔ تو تم تو ساری دنیا کا کارخانہ چلاتے ہو تمھیں کیا دقّت ہو سکتی ہے ؟"

"تم نہیں سمجھتے ہو ؟ بھگوان نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔
"بھگوان کو بھی قاعدے قانون سے چلنا پڑتا ہے۔ ورنہ یہ دنیا نہیں چلے گی !"

"کیسے نہیں چلے گی ؟"

"کیسے چلے گی ؟ اگر میں اس وقت تمھارے سلائیں کو لوہے کا

پتّرا بنا دوں۔ تو تم اسے کیسے چباؤ گے ؟"

میں نے کہا۔ " بمبئی کے بعض ہوٹلوں میں لوہے کے پنجرے سے زیادہ سخت سلائیں چبانے پڑتے ہیں !"

" اگر میں تمہاری چائے میں زہر ملا دوں۔ تو تم مر نہیں جاؤ گے ؟"

" بمبئی میں روز ہم لوگ زہر ملی ہوئی چائے پیتے ہیں۔"

اگر میں روشنی کی رفتار اتنی کم کر دوں کہ۔ وہ سورج سے زمین تک آتے تین میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے لگے۔ تو جبتک روشنی تم تک پہنچے گی کیا تم مر نہ جاؤ گے ؟"

میں چپ ہو گیا۔ بھگوان نے آخری بات تو بالکل ٹھیک کہی تھی میں سر جھکا کر پلیٹ میں آملیٹ ڈھونڈھنے لگا

دادر پل کے نیچے

تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگ دادر پل کے نیچے کھڑے تھے۔ پل
کے نیچے ایک طرف مندر تھا جہاں سادھو بھنگ گھوٹ رہے تھے
ایک طرف ریلوے اسٹیشن کے آہنی جنگلے سے لگے خارش زدہ کتے
سو رہے تھے ایک طرف کچرا پٹی کے ڈھیر تھے۔ ایک طرف
دادر پل کا زینہ تھا۔ جہاں پھٹی گدڑیوں میں لپٹے ہوئے بھکاری
بھیک مانگ رہے تھے، غرضیکہ شمال، مغرب، جنوب مشرق جدھر
دیکھو خوبصورت مناظر نظر آتے تھے!
بھگوان نے ناک بھوں چڑھا کر کہا۔ ''یہ تم مجھے کہاں لے آئے؟''

"بچوں سے ملانے کے لئے؟"

"مگر بچے ہیں کہاں؟"

میں نے کہا ــــ "بچوں سے ملنے سے پہلے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم دونوں بھی کچھ عرصے کے لئے بچے بن جائیں؟ میرا خیال ہے یہ کام تم بآسانی کر سکتے ہو۔ اس میں فارن ایکسچینج نہیں لگتا ہے!"

دوسرے لمحے میں ہم دونوں بچے بن گئے۔ ہم دونوں نے ایک پھٹی نیکر اور ایک پھٹی میلی کچیلی بنیائن پہن رکھی تھی۔ میرے ہاتھ میں امرود کی ایک ٹوکری تھی۔ بھگوان نے اپنے سر پر لکڑی کی ایک بڑی سی ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں انھوں نے بچوں کے پڑھنے کے لئے بڑی خوبصورت اور رنگین کتابیں سجا رکھی تھیں۔ ہم دونوں جلدی سے دادر پل کا زینہ چڑھ کر پل کے اوپر جا پہنچے۔ اور میں نے جلدی سے ٹوکری اتار کر لوہے کے جنگلے کے قریب رکھ دی۔

"اے۔ کیا کرتا ہے؟" ایک بڑھیا زور سے چلائی! "ٹوکری یہاں سے اٹھاؤ۔"

وہ ایک بڈھی اور بدصورت بڑھیا تھی۔ اور اس کی آواز

بیحد بھیانک اور کرخت تھی۔ اور اُس نے بھی میری طرح اپنی ٹوکری میں امرود سجا رکھے تھے۔

میں نے کہا۔"یہ سرکاری پُل ہے یہاں ہر کوئی اپنا سودا بیچ سکتا ہے۔ دیکھو چاروں طرف لوگ اپنا اپنا مال بیچ رہے ہیں۔ پھر میں یہاں کیوں نہ بیٹھوں؟ تمھارے باپ کا پُل ہے؟"

بڑھیا کے بالکل قریب ایک آٹھ سال کا چھوکرا اپنے سامنے ایک ٹوکری رکھے بیٹھا تھا۔ جس میں کیلے بھرے ہوئے تھے۔ اس نے گھور کر غصہ سے مجھے تاکا۔ بولا

"ٹوکری اٹھاتے ہو کہ نہیں؟"

میں نے کوئی جواب دینے سے پہلے اُس لڑکے کی طرف دیکھا قد میں، عمر میں اور طاقت میں بھی وہ مجھ سے کم دکھائی دیتا تھا۔ لہٰذا میں نے اکڑ کر کہا۔

"نہیں اٹھاؤں گا۔ یہیں بیٹھوں گا۔"

وہ لڑکا بجلی کی سی تیزی سے اٹھا۔ دوسرے لمحے میں اس کی ایک ٹانگ میرے پیٹ میں تھی۔ ایک مُکّا میرے منہ پر تھا۔ اور

میں زمین پر تھا، بھگوان نے مجھے بچانا چاہا تو ایک مُکّا ان کے منہ پر بھی پڑا اور اُن کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔

"اٹھاؤ۔ ٹوکری!" وہ لڑکا تحکمانہ لہجے میں بولا۔

میں نے بھگوان کی طرف دیکھا۔ مگر بھگوان اپنی ناک پونچھنے میں مصروف تھے۔ لہٰذا میں نے ٹوکری اٹھالی اور ہم دونوں خاموشی سے آگے کو ہو لئے۔

چار قدم آگے جا کر بھگوان نے آہستہ سے کہا۔

"میں اس کو ایسا مکّا مارتا کہ اُسے دن میں تارے نظر آ جاتے مگر یہ میرے اصول کے خلاف ہے!"

"بے شک، بے شک" میں اپنی کمر سہلاتے ہوئے بولا۔

چار قدم آگے جا کر ہمیں ایک اور لڑکا ملا، جو لکڑی کے ایک چھوٹے سے تختے پر فونٹین پن رکھے انھیں بیچ رہا تھا۔ اور آوازیں لگا رہا تھا —— اصلی شیفر کا پن صرف چار آنے میں۔ اصلی شیفر کا پن صرف چار آنے میں!"

بھگوان نے حیران ہو کر مجھ سے پوچھا" اصلی شیفر کا پن تو

پچھتر روپے میں بھی نہیں مل سکتا، بہ اسے چار آنے میں کیسے بیچ سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے۔ اس کا باپ کروڑپتی ہو!" میں نے کہا۔

"اور خلق خدا کا بھلا کرنا چاہتا ہو۔ آؤ اسی بھلے لڑکے کے قریب بیٹھ جائیں۔"

"جاؤ۔ جاؤ۔" اس لڑکے نے ہمیں اپنے قریب آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "کہیں کوئی دوسری جگہ دیکھو۔ میری گاہکی خراب نہ کرو۔"

میں نے کہا۔" دوست میرے پاس تو امرود ہیں۔ اور اس کے پاس کتابیں ہیں۔ پھر ہمارا تمہارا کیا مقابلہ؟"

وہ لڑکا بڑی تلخی سے بولا۔ "معلوم ہوتا ہے نئے نئے آئے ہو دادر پل پر۔ ورنہ یہ بات نہ کہتے۔ مسٹر کبھی گاہک کی صورت بھی دیکھی ہے؟ جانتے ہو گاہک کا مزاج ایک پل میں کیسے بدلتا ہے آئے گا فونٹین پن لینے اور چلا جائے گا امرود لے کر.......

جاؤ بھاگو یہاں سے ورنہ ـــــ؟"

وہ لڑکا ہم دونوں سے تگڑا بھی تھا۔ لہٰذا ہم دونوں فوراً

وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

آگے جاکر بھگوان نے خفیف ہو کر مجھ سے کہا۔ "تم سمجھتے ہو وہ مجھ سے تگڑا تھا؟ یہ بات نہیں ہے۔ میں تو اسے وہیں ختم کر دیتا مگر یہ بات میرے اصول کے خلاف ہے!"

"کیوں نہیں! کیوں نہیں!!" میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

اب ہم پُل کے بالکل آخری کونے پر آپہنچے تھے۔ راستے میں کسی نے بھی ہمیں اپنے نزدیک بیٹھنے نہیں دیا۔ یہاں آخری کونے پر ایک لڑکا تو نہیں اسے لڑکا کہنا غلطی ہوگی۔ ایک نوجوان بیس بائیس برس کی عمر کا ایک سیاہ اور کہنہ چھاتا کھولے اس میں رنگا رنگ رومال سجائے کھڑا تھا۔ جب وہ چھاتا گھماتا تھا تو گویا دھنک کے ساتھ ساتوں رنگ ہماری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے تھے۔ بھگوان نے انتہائی شیریں لہجہ میں اس سے کہا۔"ہم تمھارے پاس اپنی دوکان لگالیں۔"

اس نوجوان نے کہا "لگالو۔" مگر چار چار آنے نکالو"

بھگوان نے جلدی سے ایک اٹھنی نکال کر اسے دیدی۔

ہم دونوں اس کے قریب بیٹھ کر اپنا سودا بیچنے لگے۔ ایک گھنٹہ گذر گیا۔ میں نے تو چھ اردو بیچ لئے مگر بھگوان کی ایک کتاب بھی نہیں بکی۔

بھگوان نے ناامید ہو کر کہا۔ " اتنے چاؤ سے میں بچوں کے لئے کتابیں لایا تھا۔ مگر کوئی خریدتا نہیں!"

وہ نوجوان طنزیہ انداز میں ہنسنے لگا۔

بھگوان نے اس نوجوان سے پوچھا۔ " اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ کیا بمبئی میں بچے پڑھتے نہیں ہیں؟"

"پڑھتے ہیں!" وہ نوجوان بڑی دلجمی سے بولا۔

"میں خود بی۔ اے پاس ہوں!"

"بی۔ اے پاس ہو اور رومال بیچتے ہو؟" بھگوان نے بڑی حیرت سے اسے تاکتے ہوئے کہا۔

نوجوان پھر ہنسا۔ اس نے قریب کے ایک ساتھی کو آواز دی۔

"اے وکرم ذرا ادھر آؤ!"۔

وکرم جو سمگل کی ہوئی گھڑیاں بیچ رہا تھا۔ ہمارے قریب آیا

رومال بیچنے والے نے وکرم کا تعارف کراتے ہوئے کہا: "یہ وکرم ہے
ایف، اے پاس ہے۔"

پھر اس نے آس پاس کے دوسرے لڑکوں سے تعارف کیا۔

"یہ شریف ہے۔ انٹرنس پاس ہے۔ یہ دھوندے ہے۔
آٹھویں پاس ہے۔ یہ فیروز ہے یہ ساتویں میں پڑھتا ہے۔ یہ گورکھا
ہے یہ پانچویں میں پڑھتا ہے۔ اور عورتوں کی چوڑیاں بیچتا ہے...."
مگر...... بھگوان نے ان سب کی طرف حیرت سے دیکھ
کر کہا:

"مگر تم لوگ اسکول یا کالج کس وقت جاتے ہو؟"

"ہم لوگ کبھی اسکول یا کالج میں نہیں گئے!" وہ لوگ قہقہہ
مار کر بولے۔

"پھر تم کس طرح اپنے آپ کو ایف اے پاس یا انٹرنس پاس
کہتے ہو۔"

"یہ ہم اس لئے کہتے ہیں کہ اگر ہم اسکول جاتے تو آج میں بی اے
پاس ہوتا۔ یہ شریف انٹرنس پاس ہوتا یہ گورکھا اگر اسکول جاتا تو آج

عورتوں کی چولیاں نہ بیچتا۔ اور پانچویں جماعت میں پڑھتا ہوتا!"
ہمارے اردگرد بھیڑ دیکھ کر پولیس کا ایک حوالدار پہنچا۔ "کیا ہے؟
—— کیا ہے؟ ——" وہ اپنا چھوٹا سا ڈنڈا ہوا میں لہراتے ہوئے
بولا۔

"کچھ نہیں حوالدار جی۔" دکھڑا اپنے سانولے ہونٹوں کے اندر
سے سفید دانت نکالتے ہوئے بولا۔ "یہ دو نئے رنگروٹ آئے
ہیں! پل پر سودا بیچنے!"

حوالدار نے کہا۔ "یہ خلاف قانون حرکت ہے!"

"دو روپے نکالو۔" دکھڑے نے آہستہ سے ہم دونوں سے کہا۔
"پھر تم دونوں ایک ماہ تک دادر پل پر سودا بیچ سکو گے!"

"اور اگر ہم دو روپے نہ دیں تو؟" بھگوان نے پوچھا۔

"تو پل پر سودا بیچنا خلاف قانون ہو جائے گا!"

"ہوں!" کہہ کر بھگوان نے کچھ سوچا۔ پھر اپنی جیب سے
دو روپے نکال کر انھوں نے دکھڑ کو دے ئے۔ دکھڑ حوالدار کو ایک
کونے میں لے گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد حوالدار چلا گیا۔ سب لڑکے پھر اپنی اپنی جگہوں پر جاکر سودا بیچنے لگے۔

ڈیڑھ گھنٹہ اور گذر گیا۔ بھگوان کی ایک کتاب نہیں بکی۔ لوگ رومال خرید رہے تھے اور امرود خرید رہے تھے۔ فونٹن پن خرید رہے تھے۔ موزے خرید رہے تھے، چولیاں خرید رہے تھے اور ہیر پن اور ربن خرید رہے تھے مگر بچوں کی کتاب کوئی نہیں خریدتا تھا۔

"حیرت ہے صاحب!" بھگوان نے بڑی ناامیدی سے کہا "میرا خیال تھا۔ بچوں کے ماں باپ اپنے بچوں کے لئے خوب صورت کہانیوں کی یہ خوبصورت کتابیں فوراً خرید کر لے جائیں گے مگر۔۔۔۔۔"

"مگر جن کے پاس بچوں کی سکول کی کتابیں خریدنے کے پیسے نہ ہوں۔ وہ تمھاری کہانیوں کی کتاب کہاں سے خریدیں گے؟" میں نے بھگوان سے کہا۔

بھگوان کچھ جواب دینے ہی والے تھے۔ کہ اتنے میں زینے

کے نیچے سے ہلّہ ہوا۔ اور میں نے دیکھا کہ ایک لمبا تڑنگا آدمی اپنے گلے میں کالا تعویذ باندھے گول گلے کی دھاری دار نارنجی بنیان پہنے ایک نہایت تنگ پتلون پہنے جس کی مُہری اسی نے ٹخنوں سے اوپر چڑھا رکھی تھی۔ آہستہ آہستہ بڑے شاہانہ انداز میں زینے کے اوپر چڑھ رہا ہے۔ اسے دیکھ کر بھکاری لوگ کھڑے ہو گئے اور مؤدب جھکتے گئے۔ بہت سے لوگ کھُسر پھُسر کرنے لگے اور جب وہ زینہ چڑھ کر اوپر آیا تو رومال بیچنے والے نے اپنے بتیس دانت نکال اُسے سلوٹ کیا۔ وکرڑے نے بھی کیا۔ شریف نے بھی کیا۔ گورکھے نے بھی کیا صرف ہم دونوں فرش پر اپنے اپنے مال کے قریب بیٹھے رہے۔ اس نے ہم دونوں پر ایک چبھتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ اپنے جوتے کی نوک اس نے بھگوان کے لکڑی کے کھوکھے پر رکھی۔ جس پر کتابیں سجی ہوئی تھیں اور اسے ایک ٹھوکر مار کر وکرڑے سے پوچھا۔

"یہ بچہ لوگ ادھر کدھر سے آیا؟"

وکرڑے نے کہا:۔ "دادا یہ ۔۔۔۔۔ یہ ۔۔۔۔ نوا چھوکرا ہے آج سے ادھر دھندا کرے گا۔ حوالدار نے اجازت دیدی ہے؟"

دادا نے حوالدار کی شان میں دو چار انتہائی نفیس گالیاں رقم فرمائیں۔ پھر بولا۔" ان کو بولو۔ ہم کو روز کا چار آنہ دے گا تو ادھر پل پر بیٹھ سکتا ہے۔"

"مگر ہم کو حوالدار نے اجازت دیدی ہے!" بھگوان نے غصّے سے کہا۔" اگر سرکار ہم کو ادھر کام کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ تو تم کون ہوتا ہے ہم کو روکنے والا؟"

"ہم کون ہوتا ہے؟ ــــ" دادا کو بھی غصّہ آگیا، اس نے اپنی آستین چڑھا کر کہا۔ "ہم کون ہوتا ہے؟"

اس نے دُہرایا۔ پھر اس نے بھگوان کے سامنے رکھا ہوا لکڑی کا کھوکھا اٹھا لیا۔ اور اس نے زور سے پل کے نیچے پھینک دیا۔ تمام کتابیں مرغیوں کی طرح ہوا میں اپنے پر کھول کر پھڑ پھڑائیں۔ پھر نیچے ریلوے لائن پر جا گریں۔ دوسرے لمحے میں امرودوں سے بھری ہوئی ٹوکری بھی نیچے لڑھک گئی۔ تیسرے لمحے میں کلیان لوکل کو کتی ہوئی خوبصورت کتابوں کو روندتی ہوئی پل کے نیچے سے گذر گئی۔ اور جب کلیان لوکل گذر گئی تو بہت سے لڑکے نہ جانے کہاں سے نکل آئے اور ریل کی

پٹری پر سے گرے ہوئے امرود اٹھا اٹھا کر کھانے لگے۔ مگر کسی نے کتابوں کی طرف توجہ نہ دی۔

بھگوان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

وکرم نے دھیرے سے کہا۔ "یہ اس پل کا دادا ہے۔ سمجھو اس کا مالک ہے۔ اس پل پر اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہیں بیٹھ سکتا اس سے معافی مانگو۔ اور چار آنے روز کا بھتّہ طے کر دو۔ نہیں تو یہ تم کو حیران کرے گا۔"

"میں کاہے کا بھتّہ اس کو دوں۔ میں نہیں دوں گا۔"

بھگوان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں ہرگز نہیں دونگا اور اسی پل پر بیٹھ کر اپنا سودا بیچوں گا!"

دادا نے دانت پیس کر بھگوان کو گلے سے پکڑ لیا۔ اور اپنے کالے سیپ والا لمبا چاقو نکال لیا۔ میں نے پیچھے سے دادا کی ٹانگوں کو کاٹ کھایا۔ وہ گھوم کر مڑا تو ہم دونوں پل سے نیچے کی طرف بھاگ لئے۔ اس نے دور تک ہمارا تعاقب کیا۔ مگر ہم دوڑتے دوڑتے رنجیت سٹیڈیو کے اندر گھس گئے۔ اور چونکہ اس

علاؤ کا دادا دوسرا تھا اس لیئے پہلے دادا کو رنجیت اسٹیڈیو کے اندر گھسنے کی ۔ ۔ ۔ ہمّت نہ پڑی اور وہ ہمیں گالیاں دیتا ہوا واپس چلا گیا۔

آدھ گھنٹے تک ہم لوگ اسٹیڈیو کے آرٹ ڈیپارٹمنٹ میں گھسے رہے اور گھس کر تین سروں والی برہما کی ایک مورتی کے پیچھے چھپے رہے۔ آخر جب چاروں طرف سنّاٹا ہو گیا اور سانس میں سانس اور جان میں جان آئی تو ہم دونوں دھیرے دھیرے آرٹ ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکلنے لگے۔ یہ لنچ کا وقت تھا اور سب لوگ کینٹین میں گئے ہوئے تھے۔ اس لئے آرٹ ڈیپارٹمنٹ میں سنّاٹا تھا۔

بھگوان برہما جی کی مورتی کو دیکھ کر بولے۔ "یہ تین سروں والی مورتی برہما جی کی ہے نا؟"

"ہاں!"

"کیا اس کی یہاں پوجا کی جاتی ہے؟"

"نہیں سرکار فلم اسٹیڈیو میں نقد نارائن کے علاوہ اور

کسی کی پوجا نہیں کی جاتی۔ یہ تو پلاسٹر کے مٹی کے برہما جی ہیں یہ سیٹ پر رکھے جائیں گے اور جب ان کا کام ختم ہوگا، انھیں توڑ کر اسی مٹی سے راون کا بت بنا لیا جائے گا"۔

"ہم" بھگوان کچھ سوچ کر مسکرانے لگے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

بھگوان نے کہا۔" جب میں نے سرشٹی رچی تو برہما نے مجھ سے اپنے جسم کے لئے ایک سر کے بجائے تین سر مانگ لئے۔ میں نے حیران ہو کر۔" برہما جی۔ تین سر لے کر آپ کیا کریں گے؟

مگر برہما جی اپنی بات پر ڈٹے رہے۔ بولے۔ آپ دیدیجئے نا آپ کا کیا بگڑتا ہے؟

چنانچہ میں نے برہما کو تین سر دیدیئے۔ مگر اس وقت برہما جی کی ضد میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ آج جس وقت میں دادر پل پر کھڑا تھا اور اس غنڈے نے میرا گلا دبایا۔ تو یکایک مجھے محسوس ہوا کہ دادر پل پر کام کرنے کے لئے انسان کے پاس ایک کے بجائے چار سر ہونے چاہئیں۔

اب سوچتا ہوں ۔ برہما جی غلط نہیں تھے !" بھگوان نے مسکرا کر کہا۔

"غلط تھے یا صحیح تھے یہ اپن کو معلوم نہیں ہے ۔ بڑے لوگوں کی باتیں بڑے لوگ جانیں ۔ اپن تو جانتے ہیں کہ اس دنیا میں ایک سر بچانا ہی مشکل ہے ۔ تین سر ہوتے تو تین منھ بھی ہوتے روٹی اپن لوگ کدھر سے ڈالتے ؟"

اور روٹی سے خیال آیا۔ کہ مجھے سخت بھوک لگی ہے !

"اونہہ ! تمہیں تو ہر وقت بھوک لگی رہتی ہے !"

بھگوان نے طنزیہ فرمایا۔

"کیا تمہیں بھوک نہیں لگتی ؟"

"نہیں ۔ مجھے کبھی بھوک نہیں لگتی ؟" ہاں کبھی کبھی میرے سر میں درد ہوتا ہے ۔" بھگوان نے یکایک افسردہ ہو کر کہا۔

"کب درد ہوتا ہے ؟"

" جب کوئی ستارہ اپنی چال سے بہک جاتا ہے ۔ جب کوئی بچہ اپنی ماں سے بچھڑ جاتا ہے ۔ جب کوئی پھول وقت سے

پہلے مرجھا جانا ہے۔ اس وقت میرے سر میں درد سا ہونے لگتا ہے"۔

"درد سر میں کہ دل میں ہوتا ہے؟"

"سر میں۔ کیونکہ میرے پاس کوئی دل نہیں ہے۔ دل تو میں نے دیوتاؤں کو بھی نہیں دیا۔ دل تو میں نے صرف انسانوں کو دیا ہے کیونکہ صرف وہی گناہ کر سکتے ہیں!"

میں مبہوت ہو کر بھگوان کو دیکھنے لگا۔ مگر اُس کے چہرے پر کچھ نہ تھا۔ کوئی سوچ نہ تھی، کوئی فلسفہ نہ تھا۔ صرف بچوں کی معصومیت تھی۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے ہمارے قریب زمین پر بیٹھے گنیش کی مورتی کا سونڈ اوپر اٹھا اور پھر بھگوان کے قدموں میں جھک گیا۔ بھگوان نے چونک کر میری طرف دیکھا اور ہولے سے مسکرا کر کہا۔

"چلو۔ تمھاری بھوک بھی مٹا دیں!"

"ناممکن ہے۔ بھلا انسان کی بھوک بھی کسی نے مٹائی ہے؟"

رنجیت اسٹیڈیو کی کینٹین میں میں نے پہلے تو کوکو کولا پیا۔ پھر میں نے دال فرائی، چکن فرائی، بریانی فرائی اور کھیر ملائی کا

آرڈر دیا اور بھگوان نے اپنے لئے پھر اسپرو منگالی۔ بھگوان نے اسپرو کھائی اور ہم نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ اور جب بل بھگوان نے ادا کیا تو اس کے بٹوے میں سو کے نوٹ دیکھ کر ایک بونے فلم اسٹار کی آنکھیں کھل گئیں۔

یہ بونا فلم اسٹار جس کا نام ٹکو تھا اور جو فلموں میں بچے یا لڑکے کا کام کرتا تھا۔ جس کی عمر چالیس برس کی تھی اور جو کامیڈی رول بہت اچھا کرتا تھا آج کل اچھی حالت میں نہیں تھا۔ جس بھوکی نگاہ سے وہ سامنے رکھی ہوئی میری بھری ہوئی پلیٹوں کو دیکھ رہا تھا۔ اسی سے مجھے اس کی حالت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ دادر کے چوراہے پر پان کی دوکان پر وہ مجھے اکثر ملا کرتا تھا اور گاہے گاہے دو چار آنے مجھ سے ادھار لے لیا کرتا تھا۔ یعنی جب میں اس پوزیشن میں ہوتا تھا کہ کسی کو کچھ ادھار دے سکوں!

ٹکو کا چہرہ بے ریش و بروت اور بالکل معصوم اور بھولا بھالا نظر آتا تھا۔ اُس کا قد ہم دونوں سے بھی ایک فٹ کم تھا۔ ٹکو بھگوان کو دیکھ کر مسکرایا اور ان کے قریب جا بیٹھا۔

"تم بمبئی میں نئے نئے آئے ہو؟" ٹکّو نے مجھے چکن کی پلیٹ صاف کرتے دیکھ کر بڑی حسرت سے اپنی زبان اپنے ہونٹوں پر پھیری ۔ اور بھگوان سے کہا۔

مگر بھگوان سے بات کرتے وقت اس کی ایک آنکھ مجھ پر تھی ایک بھگوان پر۔

بھگوان نے کہا۔ "ہاں آج ہی آیا ہوں"۔

"فلم میں کام کرنے کا ارادہ ہے؟"

"ہے تو سہی۔ اگر مل جائے!"

"تمھارے ماں باپ کہاں ہیں؟"

"میرے ماں باپ تو ہیں نہیں"۔ بھگوان نے سر جھکا کر افسردگی سے کہا۔

ٹکّو ادر ان کے قریب ہو گیا۔ بھگوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اور میری طرف اشارہ کر کے بولا۔ "یہ تمھارا چھوٹا بھائی ہے؟"

"نہیں، محض ایک دوست ہے!" بھگوان نے کہا۔

ٹکّو نے انتہائی شبہہ کی نگاہوں سے مجھے دیکھا، جیسے مجھے دوست

نہیں چور سمجھ رہا ہو۔ میں نے بھی جواب میں اس کی طرف انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔

ٹلّو نے پوچھا۔ "کیا یہ بھی فلم میں کام کرنے کے ارادے سے آیا ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں ہے۔ اسی سے پوچھو"۔ بھگوان بولے۔

"پوچھنے کی کیا ضرورت ہے!" ٹلّو نے انتہائی تحقیر آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "اس کا چہرہ کہے دیتا ہے کہ یہ زندگی بھر فلم اسٹار نہیں بن سکتا!"

"اور میرا چہرہ"۔ بھگوان نے پوچھا۔

"تمھارے چہرہ پر ایک عجیب سی دلآویز معصومیت ہے تمھارا چہرہ ایسا ہے کہ بڑے سے بڑا اچھا اداکار تمھارے قدموں میں جھک جائے۔ تمھارا چہرہ، چہرہ ہے!"

"اور میرا چہرہ شاید تھوبڑا ہے!" میں نے جل کر ٹلّو سے کہا ٹلّو مجھے اس وقت پہچان نہیں رہا تھا۔ کیونکہ میں اس وقت ایک بچہ کی صورت میں تھا۔ ورنہ میں ٹلّو کو اس وقت ٹھیک کر دیتا۔

مگر ٹکّو نے میری بات سنی ان سُنی کرتے ہوئے بھگوان سے کہا۔

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"بھگوان!"

"تمھاری عمر کیا ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں!"

"میری عمر کے معلوم ہوتے ہو۔ بڑی مشکل سے بارہ برس کے ہو گے!"

"کیا تم بھی بارہ برس کے ہو؟" بھگوان نے ٹکّو سے پوچھا۔

"اگلی کرسمس میں بارہ برس کا ہو جاؤں گا!"

ٹکّو نے انتہائی انکساری سے کہا، پھر اس نے بڑے پیار سے بھگوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آج سے تم مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھو۔ میرا نام ٹکّو ہے، مجھے اس فلم انڈسٹری میں کام کرتے ہوئے تین سال میرا مطلب ہے تین سال ہو گئے ہیں۔ چائیلڈ سٹاروں میں میرا نام صفِ اول کے سٹاروں میں آتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ میں اس پوزیشن کو کبھی نہیں پہنچ سکوں گا جو عنقریب تمہیں حاصل ہونے

والی ہے ! تمھاری آنکھوں میں ایک بات ہے !"

"کیا بات ہے !"

ٹھگو نے ان سنی کرتے ہوئے بھگوان سے کہا۔ "اگر تم میرے کہنے پر چلو تو میں تمہیں فلم انڈسٹری کا سب سے بڑا اسٹار بنا دونگا سب سے بڑا چائیلڈ سٹار تمہیں معلوم ہے ۔ ڈیزی ایرانی کو ایک پکچر میں کام کرنے کا کیا ملتا ہے ؟"

بھگوان نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا ملتا ہے ؟"

"تیس ہزار !"

"تیس ہزار ؟ ـــــ نہیں ـــ نہیں یہ ناممکن ہے !"

بھگوان نے تقریباً چیخ کر کہا، "دس سال کی بچی کے لئے اتنی بڑی رقم ؟

اور فلم اسٹار سومی کو کیا ملتا ہے ۔ آٹھ سال کا ہے وہ صرف آٹھ سال کا ؟ جانتے ہو اسے ایک پکچر میں کام کرنے کا کیا ملتا ہے ؟"

بھگوان نے انجان ہو کر سر ہلایا ۔

"چالیس ہزار!"

"چالیس ہزار؟——"

ٹکّو نے کہا آج سے پندرہ برس پہلے میرا مطلب ہے آج سے پانچ سال پہلے یعنی آج سے پانچ ماہ پہلے میں نے ہی اسے ایک فلم میں کام دلوایا تھا۔"

"چالیس ہزار!" بھگوان نے حیرت سے کہا: "اور مجھے ان لوگوں نے چلتے وقت صرف سو روپے دئے تھے۔ آج تک میں نے سو روپے سے زیادہ روپے ہی نہیں دیکھے"۔

"میرے ساتھ آؤ، میں تمھیں فلم ڈائرکٹر سے ملائے دیتا ہوں!"

ٹکّو بھگوان کو گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ لے گیا۔

"ارے کہاں جا رہے ہو بھگوان میرے کہاں جا رہے ہو"!

میں نا امیدی سے چلّایا۔

"فلم اسٹار بننے!" بھگوان نے جلدی سے جواب دیا۔ ان کے لہجے میں غیر معمولی حسرت تھی! "تم یہیں بیٹھو"۔

دادر پل کے نیچے

بھگوان نے مجھے اپنے پیچھے آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "یہیں کینٹین میں۔ میں ابھی فلم اسٹار بن کر آتا ہوں!"

میں غصے سے دانت پیس کر کینٹین میں بیٹھ گیا۔

وہ ایک گھنٹے کے بعد واپس آئے۔ اور اکیلا واپس آئے بکو ان کے ساتھ نہیں تھا۔

"ٹکو کہاں ہے؟" میں نے بھگوان سے پوچھا

"وہ وہیں رہ گیا"۔ کہنے لگا۔ "آج شام کو مجھے ہند ماتا سنیما کے باجو میں ملو!"

"اچھا بات بتاؤ۔ کیا ہوا۔ کس کے پاس لے گیا تھا نہیں!" میں نے جلدی جلدی سے ان سے پوچھا

بھگوان بہت خوش تھے۔ مسکراہٹ ان کے چہرے پر کھلی پڑتی تھی۔ "اب میں چند دنوں میں فلم سٹار بن جاؤں گا۔ مجھے سورگ جانے کی کیا ضرورت ہے۔ سنتے ہو۔ اب میں واپس سورگ نہیں جاؤں گا۔ یہاں پر میں اگلے ہفتے ایک فلم میں کام کر رہا ہوں۔ وہ لوگ مجھے پہلی پکچر میں تین ہزار روپے

دیں گے۔ مجھے ایک ایئر کنڈیشنڈ فلیٹ بھی لے دیں گے۔ سیر کرنے کے لئے میرے پاس ایک کیڈیلک ہو گی۔ کون احمق سورگ جانا چاہتا ہے۔ یہاں پر مجھے سب کچھ مل جائے گا۔ جو سورگ میں بھی نہیں ملتا۔ سب اخباروں میں میرا نام ہو گا۔"

"تمھارا نام پہلے ہی لیا جاتا ہے! تمھارا نام تو ہر جگہ لیا جاتا ہے!"

"مگر اخباروں میں تو نہیں لیا جاتا! ـــــ تم مجھے بتا دو کس اخبار میں میرا نام آتا ہے۔ ٹھیک ہے۔ وہ لوگ میرا نام مندر میں لیتے ہیں۔ مسجد میں لیتے ہیں۔ گوردوارہ اور گرجا میں لیتے ہیں۔ مگر اخباروں میں تو نہیں لیتے، نائٹ کلب میں نہیں لیتے۔ ہوٹل میں نہیں لیتے، کسی دلچسپ جگہ میرا نام نہیں لیا جاتا، مگر اب مووی فیئر میں میری تصویر پوجی جائے گی اور میں نروپا رائے کے ساتھ کام کروں گا۔ اور جانتے ہو۔ اور جانتے ہو اس میں اشوک کمار اور پران بھی ہیں۔" بھگوان تقریباً خوشی سے ناچنے لگا۔

"باؤلے ہوئے ہو" میں نے بھگوان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

دادر پل کے بچے

"دنیا کون چلائے گا؟"

"جہنم میں بھیجو۔ اس دنیا کو"۔ بھگوان نے گرج کر کہا

"مجھے اس دنیا کے نام ہی سے سر میں درد ہونے لگتا ہے"۔

میں نے پریشان ہو کر پھر ایک کوکو کولا پیا اور ان سے پوچھا۔ "آخر یہ سب کچھ اتنی جلدی کیسے طے ہو گیا"

"میرا چہرہ۔ میرا بھولا بھالا چہرہ دیکھ کر ایک دم طے ہو گیا"

بھگوان نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ٹلو" بہت اچھا لڑکا ہے وہ مجھے سب سے پہلے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے پاس لے گیا۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے بڑی ہمدردی سے میری رام کہانی سُنی اور جب اُسے معلوم ہوا کہ میرے ماں باپ کوئی نہیں ہیں اور میں فلم میں کام کرنا چاہتا ہوں تو اُسے مجھ پر بڑا رحم آیا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا تمھاری جیب میں کیا دو روپے ہیں؟ میں نے کہا۔ ہیں؟ وہ بولا مجھے دیدو۔ آج ڈائرکٹر نے مجھے لنچ کے پیسے نہیں دئے۔ کل تمھیں واپس کر دوں گا۔ ایک بہت اچھا رول ہے۔ اگلی پکچر میں

بس اس میں تم چائلڈ سٹار بن جاؤ گے۔ میں تمہیں ابھی فلم ڈائرکٹر
سے ملوائے دیتا ہوں۔ چنانچہ میں نے اسے دو روپے دیدئے۔"

"دو روپے دیدئے" میں نے بیزاری کے عالم میں پوچھا۔

"ہاں۔ اور وہ مجھے فوراً فلم ڈائرکٹر سے ملانے کے لئے لے گیا
فلم ڈائرکٹر شاٹ لینے میں بیحد مصروف تھا۔ مگر جب ٹکو اور اسسٹنٹ
فلم ڈائرکٹر نے اُسے جاکر بتایا کہ ایک نہایت ہی خوبصورت بچہ
فلم میں کام کرنے کے لئے آیا ہے تو وہ دوڑا دوڑا میرے پاس آیا
اور اس نے مجھ سے میری رام کہانی سنی اور جب اُسے معلوم ہوا۔ کہ
میرے ماں باپ نہیں ہیں تو اُسے مجھ پر بڑا رحم آیا۔ اور اس نے
مجھ سے پوچھا۔ تمھاری جیب میں دس روپے ہیں؟ میں نے کہا
ہیں؟ تو وہ بولا مجھے دیدو۔ آج پروڈیوسر نے مجھے میرا چیک نہیں
دیا ہے۔ کل مل جائے گا تو تمہیں ادا کر دوں گا۔ اور تم اگلی پکچر
میں میرے ساتھ کام کر رہے ہو۔ چنانچہ میں نے اسے دس روپے
کا نوٹ دیدیا اور اب میں اس کی اگلی پکچر میں کام کر رہا ہوں پھر
اس کے بعد ٹکو فلم ڈیوسر سے ملانے کے لئے لے گیا۔ اس کے پاس

کلکتے سے ٹرنک کال آنے والا تھا۔ مگر جب اسے علم ہوا تو فوراً بھاگا بھاگا میرے پاس آیا۔ اور اس نے بڑی ہمدردی سے مجھے اپنے پاس بٹھا کر میری رام کہانی سنی اور جب اسے معلوم ہوا کہ میرے ماں باپ نہیں ہیں تو اُسے مجھ پر بڑا رحم آیا اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا، کیا تمہاری جیب میں پچیس روپے ہیں؟ میں نے کہا۔ ہیں؟ تو وہ بولا۔ مجھے دیدو۔ آج میرا چیک ڈسٹری بیوٹر لے آنے والا تھا۔ مگر نہیں آیا۔ کل آجائیگا کل آتے ہی تمھارے پچیس روپے مجھیں واپس کر دوں گا، اور تم سے تیس ہزار روپے کا کنٹریکٹ بھی کر لوں گا۔" چنانچہ میں نے اسے پچیس روپے دیدئے اور اب میں اشوک کمار، پران اور نروپارائے کے ساتھ کام کر رہا ہوں!"

بھگوان نے بڑی دلجمعی سے کہا اور چپ ہو گئے، ان کا معصوم چہرہ مسرت سے چمک رہا تھا۔

میں نے اپنا ماتھا پیٹ لیا، پھر اُن سے پوچھا۔ "اور ٹکّو نے تم سے کچھ نہیں لیا؟"

"نہیں۔ پانچ روپے اس نے بھی لئے تھے۔ مگر وہ کل واپس کرنے والا ہے۔ اور آج شام کو مجھے ہند ماتا کے باجو میں ملنے والا ہے۔ جہاں سے وہ مجھے ایک نئی فلم کمپنی میں لے کے جانے والا ہے۔ ٹکّو بہت اچھا لڑکا ہے!"

"ٹکّو لڑکا نہیں ہے!" میں نے غصّے سے تقریباً اپنے بال نوچتے ہوئے کہا۔ "وہ چالیس برس کا بونا ہے! جو لڑکوں کا پارٹ کرتا ہے۔ بھگوان کی قسم تم کتنے احمق ہو؟"

بھگوان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اور مجھے اس کا بھولا بچوں کی طرح معصوم چہرہ بہت پیارا لگا اور میرے دل کو دکھ ہوا۔ کہ میں نے کیوں اُن کا خواہ مخواہ دل دُکھایا۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "اچھا جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب یہاں سے باہر نکلو نہیں تو تمھارا بٹوہ صاف ہو جائے گا۔"

شام کے پانچ بجے ہم لوگوں نے ہندماتا سینما کے باجہ میں کھڑے ہو کر دو گھنٹے تک ٹکو کا انتظار کیا۔ مگر ٹکو نہیں آیا۔

رات کو کھولی میں ہم دونوں فرش پر چٹائیاں بچھا کر قریب قریب لیٹے تھے۔ کھولی کے اندر آ کر ہم دونوں پھر بچوں سے بڑے بن گئے۔ اور اپنی اصلی حالت میں آچکے تھے، بھگوان نے اپنے دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔ اور اوپر چھت کو گھور رہے تھے۔ میں نے اپنی پھٹی بنیائن بھی اتار پھینکی تھی۔ کیونکہ یہاں شدید حبس تھا۔

"واقعی یہاں بیحد گرمی ہے۔ اور تمہاری کھولی میں تو بجلی بھی نہیں ہے"

"تین مہینے سے بھاڑا نہیں د تھا۔ تو بجلی والے کنکشن کاٹ گئے۔ اور ایسے میں پنکھا نہ ہو۔ تو کھولی میں شدید حبس ہو جاتا ہے!"

"واقعی مجھے بھی گرمی محسوس ہو رہی " بھگوان نے کسی قدر محجوب ہو کر کہا۔ "اب سورگ میں رہتے رہتے اچھے موسم کی ایسی بری عادت پڑ گئی ہے ـ ـ ـ ـ ـ"

"ایک بات پوچھوں؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"پوچھ لو"

"کیا سورگ کا وجود ہے؟"

"ہے؟"

"اور نرک؟"

"اور نرک بھی ہے؟"

"اور نیکی؟"

"نیکی بھی ہے۔"

"اور بدی؟"

"بدی بھی ہے۔"

"اور نیکی کی جزا ملتی ہے ۔ اور بدی کی سزا ؟"

"ہاں !"

"اس لئے تم میرے آدمیوں کو جہنم میں رکھتے ہو۔ اور نیک آدمیوں کو سورگ میں ؟"

"ہاں !"

حالانکہ برے آدمیوں کو سورگ کی زیادہ ضرورت ہے ۔ وہ جن کے دماغ میں نیکی نہ تھی۔ جن کے دل میں اندھیرا تھا۔ جن کے ہاتھ لہو سے بھرے ہوئے تھے۔ جن کی نگاہوں میں بیر جمی تھی، جن کا ضمیر ہر قدم پہ ٹھوکر کھاتا تھا۔ اُنہیں سب سے زیادہ تمھارے سورگ کی ضرورت تھی۔ کیونکہ صرف اندھیرے کو روشنی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔ صرف وہی ہاتھ معاف کئے جا سکتے ہیں جو لہو میں بھرے ہوں۔ لیکن تم ایسا کیوں کرتے ہو۔ کہ جو پہلے ہی سے خوبصورت ہیں، نیک ہیں اور خوش اطوار ہیں، جن کا دل پاک اور ضمیر مطمئن ہے انھیں تم سورگ میں بھیجتے ہو، اور جو پہلے ہی سے بدی اور نفرت برائی اور ظلم کی آگ میں جل رہے ہیں اُنھیں جہنم میں بھیجتے ہو گویا تم

سورگ کو سورگ میں اور جہنم کو جہنم میں بھیجتے ہو؟ ـــــ کیا اسی سے تمھارا مقصد پورا ہوتا ہے؟"

"تم کیا چاہتے ہو؟" بھگوان نے سوچ سوچ کر کہا۔ اُس کی بانہیں اُس کے سر کے نیچے تھیں۔ ان کی نگاہیں چھت پر تھیں۔

"میں چاہتا ہوں۔ تم بُرے آدمیوں کو کبھی کبھی سورگ میں بھیج دیا کرو۔ اور نیک آدمیوں کو کبھی کبھی نرک میں ڈال دیا کرو۔ ہر ایک کو یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اُس نے کیا کھویا ہے؟ جس گناہ میں معافی نہیں اور جس نیکی میں درد نہیں اس کا مزہ ہی کیا ہے؟"

"گویا تم یہ چاہتے ہو۔" بھگوان نے ہنس کر کہا۔ "کہ اس اندھیری کھولی میں روشنی آجائے؟ مگر مسٹر اس کے لئے تمھیں محنت کرنا پڑے گی، میں نے تخلیق کر دی ہے بدلنا انسان کا کام ہے!"

"بدلنا بہت مشکل ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے اسی لئے تو یہ کام میں نے دیوتاؤں کو نہیں سونپا انسان کو سونپا ہے۔"

وہ چپ ہو گیا۔ تاریک کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ مجھے نیند سی آنے لگی، بھگوان کی آواز میرے کانوں میں دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

..... مگر نیکی اور بدی۔ سزا اور جزا سے اوپر زندگی اور موت کا چکر ہے۔ یہ اخلاق سے بلند مطلق اور آزاد قدریں ہیں، اس وقت اینڈرومیڈا میں ایک سیارہ پھٹ رہا ہے۔ ایک لمحے میں دو کھرب جانداروں کو موت آگئی۔ ایک لمحہ پہلے وہ زندہ تھے۔ پیار کرتے تھے۔ نفرت کرتے تھے۔ ظلم کرتے تھے۔ رحم کرتے تھے امید رکھتے تھے۔ امید کھُلے آسمان کی۔ ہری کونپلوں کی مسکتے ہوئے ہونٹوں کی، ہنستی ہوئی آنکھوں کی۔ ......

مگر اسی لمحے وہ سیارہ پھٹ رہا ہے۔

اور اسی لمحے کہکشاں کے کسی دوسرے کونے میں ایک نیا ستارہ جنم لے رہا ہے، پہلے ستارہ نے کونسی بُرائی کی تھی کہ وہ مر گیا

دوسرے ستارہ نے کون سی نیکی کی تھی کہ اسے زندگی ملی ؟____

اس لئے مجھ سے نیکی اور بدی سزا اور جزا کے بارے میں کچھ نہ کہو

ایک بار میں نے منشیت کی کھٹالی میں نیکی اور بدی سزا اور جزا ،

سورگ اور نرک تاریکی اور روشنی کو اکٹھا کیا اور انسان بنا دیا۔

اب ریت میں سے سونے کے دانے چننا میرا کام نہیں ہے ۔ یہ

تم جانو !"

آواز بہت دور کہکشاں سے بھی پرے انجانی خلاؤں سے

آرہی تھی اور میں اونگھ رہا تھا کیونکہ میں دن بھر کا تھکا ہارا تھا

پھر یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے زور سے میری ران پر

ہاتھ مارا اور میں چونک کر اٹھ بیٹھا ۔

بھگوان کہہ رہے تھے ____ ابے سارے ملکٹ

اتنی جلدی سونے لگا ؟ ابھی تو رات جوان ہے ۔"

میں نے جز بز ہوتے ہوئے کہا ۔ " تم تو بھگوان ہو ۔

تمہیں تو نیند آتی نہیں ہے ۔ بندہ ایک غریب انسان ہے ۔ دن

بھر کا تھکا ہارا ہے ۔ اس لئے بندہ تو سوئے گا ۔ دوسری بات

یہ ہے حضور - کہ یہ بے تکلفی مجھ سے اچھی نہیں ! ـــــ سالا؟ ھلکٹ ؟ اپن کو یہ باتیں پسند نہیں ہیں۔ کچھ بھی کرو۔ آخر میں تم ہمارے بھگوان ہو۔ تم ہمارے باس ہو۔ ہم تمھارے داسی ہیں اور داس کی باس سے کیا دوستی ؟ اور کیسی بے تکلفی ؟ لہٰذا مجھے معاف کرو اور سونے دو۔"

یہ کہہ کر میں چٹائی پر کروٹ بدل کر سوگیا۔ بھگوان دھیرے دھیرے کہہ رہے تھے۔

"اونہہ ! اپنی بھی کیا زندگی ہے؟ اکیلا۔ تن وتنہا۔ سب اپنے پجاری ہیں دوست ایک بھی نہیں ! ایسا کوئی بھی نہیں۔ جس کے شانے پہ بے تکلفی سے ہاتھ مار کر اسے سالا کہہ سکوں؟ ـــــ کاش کوئی ایسا ہوتا جو مجھے پیار سے گالی دے سکتا! ہائے کیسی خوفناک تنہائی ہے۔ ۔ ۔ ۔

جانے کتنی دیر تک وہ کہتے رہے، میں ان کی اداس میٹھی مدھم شہد بھری آواز کے جھولے میں خراٹے لینے لگا۔ جب جاگا تو صبح ہو چکی تھی۔ اور روشندان سے تیز دھوپ کی ایک لمبی

تکون سامنے دیوار پر لرز رہی تھی۔ میں ہڑبڑا کر جاگا تو سامنے
چٹائی پر ایک خوبصورت اور بھولا بچہ سو رہا تھا۔ آٹھ سال
کا پیارا سا اور خوبصورت بچہ اُس کی لانبی لانبی پلکیں اس کے
رخساروں پر جھکی ہوئی تھیں اور نیند میں آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔

دادر پل کے بچے

بچوں سے ملاقات کرتے ہوئے بھگوان کا بمبئی میں دوسرا دن تھا۔ آج صبح ہی میں نے ان کا تعارف منہر سے کرایا تھا۔ منہر ایک دبلا پتلا سوکھا سڑا سا گجراتی لڑکا تھا۔ مگر باتیں کرنے میں بے حد تیز تھا اس کی بھوکی بے چین آنکھیں گویا ہر وقت کسی شکار کی تاک میں رہتیں باہر کی کنڈی کھٹکھٹا کر جب وہ کھولی میں داخل ہوا تو اپنے سامنے دو بچوں کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

بولا۔ "سیٹھ کدھر ہے؟"

یہ اشارہ میری طرف تھا۔ مگر میں تو اس وقت بچہ بنا ہوا تھا

لہٰذا وہ مجھے پہچان نہ سکا۔ میں نے کہا۔ "سیٹھ باہر گیا ہوا ہے۔"

منہر نے میری طرف غور سے دیکھا۔ بولا۔ "تم سیٹھ کے لڑکے معلوم ہوتے ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور یہ کون ہے؟" منہر نے بھگوان کی طرف دیکھ کر کہا

"لڑکا ہے!" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

منہر چپ ہو گیا۔ چند لمحوں تک مجھے گھورتا رہا۔ پھر بولا۔ "سیٹھ کو بول دینا چوکا آگیا ہے۔ اُس کے نو روپے میرے پاس ہیں شام کو آکے دے جاؤں گا۔"

پھر میری طرف تیز نگاہوں سے تاکتا ہوا بولا سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیتا ہوا بولا۔

"لگاؤ گے؟"

"لگاؤں گا!" میں نے جواب دیا

"کیا؟"

"نٹے سے پانچا؟"

"کتنا؟"

"دو آنے!"

منہر نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر نوٹ کر لیا۔ میں نے بھگوان سے ایک دوانی ادھار لیکر اُسے دیدی۔ پھر منہر بھگوان کی طرف مڑا۔ اور مجھ سے پوچھنے لگا۔

"اور یہ لگائے گا؟"

"کیا؟" بھگوان نے پوچھا۔

"نمبر!" منہر نے جواب دیا

"نمبر کیا ہوتا ہے؟" بھگوان نے پوچھا۔

منہر حقارت سے ہنسنے لگا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "یہ کل ہی اپنے گاؤں سے آیا ہے!"

منہر جھٹ بھگوان کے پاس بیٹھ گیا اور اسے سمجھانے لگا۔ "یہ سٹّے کا نمبر ہوتا ہے۔ اوپن ٹو کلوز لگایا جا سکتا ہے۔ اوپن لگایا جا سکتا ہے۔ کلوز لگایا جا سکتا ہے۔ شام کو جب بھاؤ کھلے گا تو اگر تمھارا نمبر آگیا تو تمھیں ایک روپے کے نو روپے دوں گا۔"

"ایک روپے کے نو روپے؟ اور بھگوان نے حیرت سے کہا۔

"ہمارے ہاں تو ایک بدی کی ایک ہی سزا ہوتی ہے۔ اور ایک نیکی کی ایک ہی جزا ملتی ہے۔"

"یہ سزا جزا کیا بولتا ہے؟" منہر حیران ہو کر مجھ سے پوچھنے لگا۔

"یہ اس کے ملک کا سٹہ ہے!"

"اچھا ـــــ تو پھر اس سٹے میں مزا کیا؟ ـــــ یہاں ایک لگاؤ تو نو ملیں گے۔ اور ہاتھ سے جائے گا صرف ایک ہی!"

"یہ تو بڑے مزے کا کھیل ہے!" بھگوان نے خوش ہو کر کہا۔ "ایک چونی میں بھی لگاتا ہوں!"

"کس پر؟"

"نیکی پر!"

"پھر وہی نیکی؟" میاں کوئی نمبر بولو۔ ایک سے بندی تک یا اوپن لگاؤ یا کلوز لگاؤ۔ اوپن ٹو کلوز لگاؤ۔ اور جلدی

لگاؤ۔ اپنے پاس جاسنتی ٹائم نہیں ہے"۔

" وقت تو کبھی ختم نہیں ہوتا!" بھگوان نے آہستہ سے کہا۔

منہر بولا۔ "یہ تمھارا دوست کیسی باتیں کرتا ہے۔ کس ملک سے آیا ہے؟ سٹّہ لگانا ہے تو لگاؤ، ورنہ میں جاتا ہوں"۔

"کیا تم سکول نہیں جاتے ہو"؟ بھگوان نے پوچھا

منہر نے ہنس کر کہا۔ "بی اے پاس کرنے والے دادر پوسٹ آفس کے باہر خط لکھتے ہیں اور دس آنے روز کماتے ہیں۔ یہاں سٹّے سے دن میں دس روپے کما لیتا ہوں۔ میں سکول جاکر کیا کروں گا معلوم ہوتا ہے تم کو مجھ سے دھندا نہیں کرنے کا ہے۔ اچھا میرا کھوٹا ہوتا ہے۔ اپن جاتا ہے!"

جب منہر چلا گیا۔ تو بھگوان نے کہا۔ "یہ سٹّہ کھیلتا ہے بارہ سال کا بچّہ ہو کر سٹّہ کھلاتا ہے؟ سٹّہ تو جوا ہے"۔

"بمبئی کی تین چوتھائی آبادی سٹّہ کھیلتی ہے اور جیتنے کی امید پر صبح سے شام کرتی ہے۔ تم یہ خوشی بھی ان کے ہاتھ سے چھین لینا چاہتے ہو"۔

"مگر وہ تو بچہ ہے۔"

"بمبئی میں ہزاروں بچے دن رات یہی کاروبار کرتے ہیں۔ کوئی سڑک، کوئی حصّہ، کوئی بازار، کوئی گلی ان بچوں سے خالی نہیں ہے۔"

"اوپن ٹو کلوز؟ بھگوان غصّے سے بڑبڑایا۔ منہہ اوپن ٹو کلوز میں نو کا بھاؤ دینا ہے تم اپنے اوپن ٹو کلوز یعنی زندگی سے موت تک کیا دیتے ہو۔ لاتیں، مکّے، بھوک، بیکاری، مفلسی؟" میں نے جل کر کہا۔

"چلو اس کھولی سے باہر نکلیں۔" بھگوان نے گھبرا کر کہا۔ اس میں کیا شبہہ ہے، بھگوان نے کامل اعتماد کے سامنے کے خوبصورت منظر پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں آج شام ہی کو واپس سورگ چلا جاؤں گا۔

دادر پل کے نیچے

ماہم میں کرسٹان لوگ کے بچوں کا بڑا میلہ تھا۔ سینٹ اینڈریوز
چرچ کا وسیع کمپاؤنڈ لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ رنگا رنگ جھنڈیاں
لگی ہوئی تھیں۔ کمپاؤنڈ کے ایک کونے میں پتھروں کے ایک کھلے
مندر میں مقدس مریم کے بت کے آگے لوگ دراز ہوتے تھے۔
خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے بچے، مرد، عورتیں گرجا کے اندر
مومی شمعیں لے جا کر جلا رہے تھے۔

کمپاؤنڈ کے باہر بچے اور بڑے سبھی چکر دار جھولے میں جھول
رہے تھے۔ پانی پوری کھا رہے تھے۔ یسوع مسیح کی تصویریں

خرید رہے تھے۔ گلٹ کی خوشنما صلیبیں۔ امریکی تراشش کی
جینز اور پتلون کی پیٹیاں، غبارے اور چاکلیٹ اور مٹھائیاں
سستی خوشبوئیں، لپ اسٹک کاغذی پھول اور ریشمی رومال
بک رہے تھے۔ چاروں طرف ایک دلچسپ ہنگامہ تھا۔ دلچسپ
شور تھا اور رنگوں کا ہجوم تھا۔

بھگوان اس نظارے سے بے حد محظوظ ہوئے۔ دیر تک
ادھر ادھر گھومتے رہے، صاف ستھرے، چہکتے ہوئے بچوں اور
ان کے ماں باپ بھائی بہنوں کو دیکھ کر بیحد خوش ہوئے۔ بولے
"بس سب بچوں کو اسی طرح ہونا چاہیئے۔ ایسی ہی دنیا ہونی چاہیئے
ہمارے بچوں کی . . . . ایسی ہی خوبصورت!"

میں تو بھوکا تھا، لہٰذا میں نے پانی پوری کی چار پلیٹیں
ڈکار لیں، کئی تو چاکلیٹ کھائے۔ اور دونوں جیبوں میں مٹھائی
ٹھونس لی اور بھگوان کی خوشنما فلسفیانہ باتوں اور آدرشوں کو
تضحیک آمیز تبسم سے سنتا رہا۔ "اس دنیا میں زندگی کا ایسا
فلسفہ تو آج کل کے چھ سال کے بچے کا نہیں ہوتا، جانے تم کس

دنیا کی بات کرتے ہو بھگوان!"

بھگوان نے اشک آمیز نگاہوں سے اپنے سامنے کے سینکڑوں صاف ستھرے، بچوں کو دیکھ کر مجھ سے کہا۔۔۔۔ ان خوبصورت پیارے، معصوم مہذب بچوں ہی کو دیکھنے کے لئے تو میں سورگ سے آیا تھا۔ انھیں بچوں کی تو مجھے تلاش تھی۔"

"اب تمہیں یہ بچے مل گئے ہیں۔ تو اب تم شاید اطمینان کا سانس لے کر سورگ جا سکتے ہو؟"

"ہاں!" بھگوان نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"تو آؤ واپس چلیں۔ تمہارے دل کی مراد پوری ہو گئی۔ اب تم سورگ کے سامنے اپنی انتہائی خوبصورت رپورٹ پیش کر سکتے ہو؟"

"اس میں کیا شبہ ہے؟" بھگوان نے کامل اعتماد سے سامنے کے خوبصورت منظر پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں آج شام ہی کو واپس سورگ چلا جاؤں گا۔۔۔۔"

"تو آؤ۔ میں تمہیں ماہم کے اڈّے پر، بس میں بٹھا دوں، تمہیں بہت دور جانا ہوگا۔"

"چلو!" کہہ کر بھگوان ہمارے ساتھ واپس ہوئے۔ کمپاؤنڈ کے باہر موم بتیاں بیچنے والا ایک چھوٹا سا لڑکا ہمارے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ "پور آرفن ۔۔۔۔ یتیم ہوں۔ پور آرفن۔۔۔۔۔۔ تین آنے میں دو کینڈل بیچتا ہوں۔ اور موم کی بتّیاں تین آنے میں لے جاؤ۔۔۔ کرائسٹ تمھارا بھلا کرے۔۔۔۔ تین آنے ہی دو۔۔۔۔۔ پور آرفن۔۔۔۔۔ مدر فادر ڈیڈ۔۔۔۔۔ تین آنے ہی دو۔۔۔۔۔"

کافی دور تک اس نے ہمارا پیچھا کیا، بھگوان تو تیرو ٹا سے اسے دیکھ کر پگھل گئے تھے اور اسی وقت موم بتیاں لینے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ مگر میرے منع کرنے پر مجبور ہو کر سر جھکا کر میرے ساتھ چل رہے تھے۔ مگر وہ لڑکا بھی بیحد مسکین تھا۔ اس کی آواز کی بیچارگی نے مجھے بھی موم کر دیا، میں نے کہا — "اچھا لو اس سے موم بتّیاں اور جانے دو سالے کو۔۔۔۔۔ کب سے ٹر ٹر لگا رکھی ہے۔۔۔۔۔"

بھگوان نے مشکور نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ انھوں نے

بچے سے موم بتّیاں خرید لیں اور اُسے تین آنے دے ۔

"کرائسٹ سیو یور سول!

لڑکا تین آنے میں ایک دو دعائیں دینے لگا

گاڈ بلیس یو

پور آرفن۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مدر فادر ڈیڈ، تین آنے میں

دو دعائیں۔

جب ہم لوگ آگے چلے گئے ۔ تو میں نے بھگوان سے پوچھا

"کرائسٹ سیو یور سول ؟ کیا تمہارے پاس بھی کوئی سول

ہے ؟ کوئی آتما ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

بھگوان نے کہا ۔ " پگلے میں تو دُکھ اور سکھ دونوں سے

بے نیاز ہوں، آتما تو اس کے پاس ہوتی ہے جو دکھ کے درد اور

مسرت کی لذت سے آشنا ہو سکے ۔"

لذت کیا ہے ؟ حیات ؟ یا احساس ؟"

"محض اک خیال !"

"تو کیا محض اک خیال کو بچانے کے لئے لوگ موم بتّیاں

جلاتے ہیں"۔

"لوگ تو محض اک خیال کے لئے اپنی زندگی تک جلا دیتے ہیں"
بھگوان نے کہا۔ "تمھیں تو معلوم ہوگا۔۔۔۔"

ہاں انھوں نے لاکھوں بار خیال کو لکڑی سے باندھ کر جلایا ہے۔ گہری قبر کھود کر گاڑ دیا ہے۔ ریشم کی دوڑ سے گھونٹ کر پھانسی پر لٹکا دیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔صلیب پر ٹھونک کر ختم کر دیا ہے۔۔۔۔۔ مگر خیال ختم نہیں ہوا۔۔۔۔۔۔ نہیں مگر یہ بات بھی غلط ہے۔۔۔۔۔

میں نے سوچ کر کہا۔" خیال بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ خیال مر جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ جیسے وہ بڈھی مر گئی جو چاندمیں بیٹھ کر سوت کاتتی تھی اسے سپوتنک نے ختم کر دیا۔۔۔۔۔ اچھی لذت تو اچھے خیال میں ہوتی ہے!"

اتنے میں باندرہ کا بس اسٹینڈ آگیا، اور میں کچھ آگے سوچ نہ سکا۔ ورنہ یہ ہوتا کہ آتما تو شاید بس کے ساتھ چلی جاتی مگر میرا جسم وہیں بس اسٹینڈ میں کھڑا رہ جاتا۔ لہٰذا ہم دونوں نے جلدی سے

بس میں بیٹھنا ہی غنیمت سمجھا۔ ڈبل ڈیکر بس تھی، اس لئے ہم لوگ اوپر کی منزل پر جا بیٹھے کہ وہاں ہوا خوب آتی ہے اور نظارہ بھی اچھا ہوتا ہے۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔ ہماری دائیں طرف کی سیٹ پر غالباً اسکول میں پڑھنے والا ایک خوش پوش لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا بڑا چرمی بستہ کتابوں سے بھرا معلوم ہوتا تھا۔ ایک کاپی اس کے گھٹنوں پر تھی۔ اوپر کی جیب میں فونٹین پن نظر آرہا تھا۔ سفید نیکر سفید جرابیں اور سفید شو پہنے ہوئے وہ بڑا پیارا سا لگ رہا تھا۔ ہم دونوں تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے، مگر اس نے ہماری طرف کوئی توجہ نہ کی۔۔۔۔

اتنے میں ٹکٹ چیکر آگیا تو بھگوان نے ٹکٹ خریدنے کے لئے جیب سے پیسے نکالنے چاہے، جیب میں ہاتھ ڈالا تو ہاتھ جیب ہی میں رہ گیا اور بھگوان کی آنکھیں خوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"کیا ہوا، میں نے پوچھا"۔

"کسی نے میری جیب کاٹ لی!"

"کب؟"

" معلوم نہیں ۔" پھر انھوں نے اپنے ہاتھ میں موم بتّیاں دیکھ کر کہا۔

" جب میں نے اس لڑکے سے یہ موم بتّیاں خریدیں، اس وقت تک تو میری جیب سلامت تھی"۔

" اور اس کے بعد چند قدم چل کر تو بس اسٹینڈ آگیا تھا، اور بس اسٹینڈ پر ہم دونوں اکیلے کھڑے تھے لہذا یہ کرامت اسی کی معلوم ہوتی ہے...... مدر فادر ڈیڈ ...... "

میں زور زور سے ہنسنے لگا۔

" مگر وہ کس قدر غریب اور یتیم معلوم ہوتا تھا اور بھولا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے..... " بھگوان نے حیرت سے کہا

" آنکھوں میں آنسو تھے اور ہاتھوں میں قینچی تھی ...... ورنہ جیب کیسے کٹتی ؟ "

" پیسے نکالو ...... " بس کنڈکٹر نے جلدی سے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

" یہ موم بتّیاں لے لو۔" بھگوان نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"انھیں جلانے سے تمہاری آتما بچ جائے گی۔"

بس کنڈیکٹر بولا۔ "آتما بچ جائے گی مگر نوکری چلی جائے گی۔

اپن ایسا کام نہیں کرنا ہے۔ پیسے نکالو.........."

پیسے تو میرے پاس نہیں ہیں۔ مگر تم مجھے ٹکٹ دیدو۔

میں تمہیں دعائیں دوں گا، بگارڈ بیلیس یو.........." بھگوان

نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"ابے چھوکرے مجاق کرنا ہے"۔ بس کنڈیکٹر غصے میں

آکر بولا۔

"ابھی نیچے اتار کر پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ نکال پیسے۔ اور

تو بھی نکال.........." بس کنڈیکٹر نے میری طرف گھورتے ہوئے

کہا۔ "گارڈ بلیس یو۔ یہ B E S T کی بس ہے۔ چرچ

کی نہیں ہے.........."

میرے پیسے بھی اسی کے پاس تھے۔ جیب کٹ گئی اس کی..

..... تو میں بھی پھانک ہو گیا ماسٹر!" میں نے عاجزی سے

کہا۔

بس کنڈکٹر نے غصہ میں آکر گھنٹی بجائی۔ بس رکنے لگی تو قریب کا چھوکرا مسکرا کر بولا۔

"تم کہاں جاؤ گے؟" وہ بھگوان سے پوچھ رہا تھا۔

بھگوان میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے اسی لڑکے سے کہا۔ "ہم بائی کلّہ اسٹریٹ تک جائیں گے"

"میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔" وہ لڑکا بولا۔ "تم دونوں کے ٹکٹ کے پیسے میں دیدیتا ہوں۔ تم لوگ بائی کلّہ برج پر اپنے گھر سے مجھے پیسے دیدینا!"

بھگوان کچھ کہنے ہی کو تھے کہ میں نے انہیں آنکھ ماری اور وہ چپ ہو گئے۔

جب وہ لڑکا ہمارے ٹکٹوں کے پیسے دے رہا تھا تو بس ماہم کے بس اسٹاپ پر آکر رک گئی تھی۔ اور پولیس کا ایک سپاہی اوپر کی منزل پر آکر غور سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ بھگوان نے پوچھا یہ کیا دیکھنا ہے؟"

سکول کا لڑکا بولا۔ "یہاں پر شراب کے لئے تلاشی ہوتی ہے

بمبئی میں نشہ بندی ہے اس لئے نا!____"

"تم کیا بمبئی میں پہلی بار آئے ہو؟" سپاہی نے بھگوان سے پوچھا

"ہاں!"

"اور جہاں سے تم آئے ہو وہاں کیا شراب ملتی ہے؟" سپاہی نے پھر پوچھا۔

"ملتی ہے!" بھگوان نے فخر سے کہا۔ "وہاں تو شراب کی نہریں بہتی ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اچھا تو دو تلاشی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" سپاہی نے قدرے سختی سے کہا اور اُس نے اچھی طرح سے بھگوان کی تلاشی لے ڈالی۔ ۔ ۔ ۔ اور ان کے ساتھ میری بھی۔ ۔ ۔ ۔ وہ سکول کا لڑکا ہم دونوں کو دیکھ کر ہنستا رہا۔ ۔ ۔ ۔ اور سپاہی اس لڑکے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد سپاہی چلا گیا تو بس بھی چلدی۔ ۔ ۔ ۔ اب وہ لڑکا اپنی سیٹ سے اٹھ کر ہمارے آگے کی سیٹ پر آبیٹھا۔ ۔ ۔ ۔ اور اس نے بھگوان سے پوچھا۔ "کتنے پیسے تھے تمھاری جیب میں۔۔؟"

"حساب تو معلوم نہیں، مگر جتنے تھے سب گئے ۔ ۔ ۔ ۔"

"پھر بھی اندازے سے بتاؤ کتنے تھے؟"

"ارے کیا بتاؤں، بھگوان نے کہا۔ "جو تھے سب گئے جتنے بمبئی کے لئے لایا تھا، سب گئے، ایک بنا پیسہ میرے پاس نہیں ہے"

"بمبئی میں کہاں رہتے ہو؟"

"کہیں بھی نہیں رہتا ہوں۔ اس کے پاس آیا تھا۔ مگر اس کے پاس بھی کوئی کام نہیں ہے . . . ." بھگوان نے میری طرف اشارہ کرکے کہا۔

وہ لڑکا میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ماسٹر۔ اپن تو گلی میں گھومنے والے بے کار لڑکے ہیں۔ تیری طرح سکول وکول نہیں جاتے ہیں۔ تو، سمجھ سے تیرے ٹکٹ کے پیسے مارے گئے . . . . اپنا بائی کلہ میں کوئی گھر نہیں ہے . . . . ماسٹر اپن ٹھیک بات کرتا ہے تیری کھوپری میں آوے تو ہم کو معاف کر نہیں تو سنتری کے حوالے کردے . . . . ."

وہ لڑکا میری گفتگو سن کر مسکرانے لگا۔ جیب سے سفید

رومال نکال کر اس نے اپنا پسینہ پونچھا۔ شاید اس نے اس قسم کی گفتگو پہلی بار سنی تھی۔ کیونکہ بیچارہ بیحد مہذب اور شائستہ گھر کا لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ ہم پر ترس کھا کر اس نے ہمارے ٹکٹ لے لئے تھے۔ مگر ہم بھی کیا کرتے ...... بائی کلّہ برج کے پار اتر کر وہ ہم سے بولا۔ "اگر آپ لوگ میرے پیسے نہیں دے سکتے ہیں۔ تو میرا بستہ اٹھا کر وہاں تک لے چلو۔"

"تمھارے گھر تک؟" بھگوان نے پوچھا۔

"یہی سمجھ لو۔" وہ لڑکا آہستہ سے بولا۔ اور اس نے اپنا بستہ بھگوان کو تھما دیا۔

بھگوان اس چرمی بیگ کو لئے لئے اس لڑکے کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ میں بھگوان کے پیچھے پیچھے۔

ٹرام کا پٹّہ پار کر کے ہم لوگ ایک تنگ سی گلی میں گھس گئے وہاں سے دوسری گلی میں گئے۔ وہاں سے تیسری میں۔ وہاں سے نکل کر ایک بازار کراس کر کے لکڑیوں کے ایک ٹال میں داخل ہوئے ٹال پر ایک میلی ٹوپی، میلی گنجی، میلی لنگی پہنے ہوئے ایک چھوکرا بیٹھا

تھا۔ عمر کوئی سترہ اٹھارہ برس کی ہو گی، اس کے رخساروں پر سیاہی مائل گہرا سبزہ تھا اور اس کا رنگ سانولا تھا اور وہ خاصہ بدصورت تھا اور اس کے چہرہ پر خارش کی پھنسیاں بھی تھیں، وہ اپنی میلی لنگی کے اندر ران کھجاتے ہوئے اس خوش پوش لڑکے سے پوچھنے لگا

"یہ کون ہیں؟" اس نے ہماری طرف اشارہ کیا۔

"میرے دوست ہیں۔"

"اعتبار والے ہیں؟"

"گریب ہیں اور ان کے پاس کوئی کام بھی نہیں ہے۔"

"کام کرو گے؟" میلی لنگی والے چھوکرے نے اپنی کرنجی آنکھوں سے ہمیں گھور کر پوچھا

"مل جائے تو کیوں نہیں کریں گے؟" ہم نے فوراً آگے بڑھ کر کہا۔

جواب میں اس نے کچھ نہ کہا۔ خوش پوش لڑکے سے اتنا پوچھا

"لے آئے؟"

"ہاں!"

دادر پُل کے نیچے

"کدھر ہے ؟"

جواب میں اس سکول کے لڑکے نے کچھ نہ کہا۔ اپنا بستہ کھولنے لگا۔ ۔ ۔ ۔ جب چرمی بیگ کھُلا تو اس میں کتابوں کے بجائے تین بوتلیں شراب کی برآمد ہوئیں !!!

بھگوان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ "میں تو سمجھا تھا تم سکول کے لڑکے ہو !"

"کون ہاکو !" وہ بڑا لڑکا زور سے قہقہہ مار کر ہنسا۔ " اپنا ہاکو، یار تو ٹھرّا اسکول کا طالب علم ہے۔ دس سال سے یہی دھندا کر رہا ہے۔ اب تو سکول پاس کر کے دھسکی کے کالج میں جانے والا ہے"

" تمھارا باپ کدھر ہے ؟" ہاکو نے جلدی سے پوچھا۔

" وہ کھانے کو گیا ہے۔ مجھ سے بول گیا تھا کہ ہاکو آئے تو اس کو روپے دیکر ٹھرّا لے لینا۔ ادھر سالا کب سے تمھارا ویٹ کرتا تھا"

"پیسے نکالو" ہاکو جلدی سے بولا

" نکالتا ہوں، پہلے ایک ایک پیک تو مار لیں۔ ۔ ۔ "

میلی لنگی والے لڑکے نے لکڑیوں کے پیچھے سے چار گلاس

نکالے .....

بھگوان نے پوچھا، ''کیا تم لوگ شراب پیو گے؟ تم ..... ؟
چھوٹے سے لڑکے؟..... تم بھی؟...... بھگوان نے ہاکو کی
طرف دیکھ کر کہا۔

ہاکو زور سے ہنسا۔ ''اس میں کیا ہے۔ ایے ٹھرّے کا دھندا
کرنا ہے تو ٹھرّے سے ڈرنا کیسا...... جب پیار کیا تو ڈرنا کیا..
..؟..... آج تم بھی چکھ لو..... ''

وہ بڑا لڑکا چاروں گلاس میں ٹھرّا ڈالتے ہوئے اور جس
بوتل سے اس نے ٹھرّا نکالا تھا۔ اس میں پانی ڈالتے ہوئے بولا۔
میرے باپ کو پتہ نہیں چلیں گا۔ سالے کو۔ کہ اس میں پانی ملا ہے
مگر اب تم لوگ جلدی سے گلاس خالی کر دو، کہیں پر میرا باپ آگیا
تو مار مار کر پلستر بگاڑ دے گا۔"

ہاکو اور وہ دونوں گلاس کو منھ لگا کر غٹ غٹ پینے لگے
ہم نے یہ موقع غنیمت سمجھا فوراً وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے
..... ہاکو اور وہ دونوں حیرت سے ہماری طرف دیکھتے ہی رہ گئے

مگر ان لوگوں نے ہمارا تعاقب نہیں کیا۔ انھوں نے غالباً ہمیں انتہائی احمق سمجھا ہوگا!

بائی کلہ برج پر پہنچکر ہم لوگ پیدل دادر کی طرف روانہ ہوئے میں نے بھگوان سے کہا۔ "اب کہاں جائیں گے؟"

"تمھارے گھر!"

"مگر تم نے تو آج شاید واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔"

"اب میں نے وہ فیصلہ ملتوی کر دیا ہے ۔۔۔۔"

"ہاکو کو دیکھ کر ۔۔۔۔؟"

بھگوان نے کوئی جواب نہ دیا، میں نے صرف اتنا دیکھا کہ اسکی آنکھ میں آنسو ہیں۔

میں نے سوچا میں بھگوان سے کہوں، تم بہت شریف ہو بھگوان بہت نیک ہو بھگوان۔ بہت ہمدرد ہو بھگوان۔ لیکن اگر آنسوؤں سے یہ دنیا بدل سکتی تو پھر ہر صبح اوس کے آنسوؤں سے کیوں سوتی رہتی؟

اُس رات کھولی میں بڑی گرمی تھی ۔ گرمی سے اور بھوک سے نڈھال ہو کر میں بالکل جھلاّ چکا تھا۔ میں نے غصے سے بھگوان سے کہا۔ " آخر تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟ اس شہر میں سینکڑوں لکھ پتی تاجر اور کروڑ پتی ٹھیکے دار اور مل مالک بستے ہیں وہ لوگ تمھیں ہر طرح کا آرام دیتے ۔ وہاں تم بڑے مزے میں رہتے ۔ کسی طرح کی تکلیف تمھیں نہ ہوتی، آخر تمہیں میرے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

" میں بھگوان ہوں، جہاں چاہوں جا سکتا ہوں" بھگوان نے ذرا تنک کر کہا۔۔۔ " تم مجھے ٹوکنے والے کون ہوتے ہو؟ تمہیں تو میرا شکر گذار ہونا چاہئے کہ میں تمہارے پاس آیا ہوں اور تم ہو کہ الٹا مجھی کو کوس رہے ہو۔۔۔"

" کیوں نہ کوسوں، صبح سے بھوکا ہوں ۔ کرسٹان لوگ کے میلے میں جو تھوڑی سی مٹھائی کھائی تھی اس کے بعد سے ایک ایک کپ چائے کا نہیں ملا۔ دن بھر تمھارے ساتھ کھوٹی کرتا ہوں اور تم ہو کہ خود کسی جیب کترے سے جیب کٹوا کر میرے سر پر چڑھے بیٹھے ہو۔"

"میرا خیال ہے تمہیں بھوک لگی ہے۔" بھگوان نے مسکرا کر کہا۔

میں نے جھلا کر کہا۔ " اب میں بھگوان تو ہوں نہیں تمہاری طرح کہ مجھے بھوک بھی نہ لگے۔"

بھگوان چپ ہو گئے۔

میں نے کہا۔ " چپ کیوں ہو گئے۔ ہمیں پیدا کیا تھا تو ہمارے جینے کا سادھن کیوں نہیں کیا؟ اب پڑے میری کھولی میں اخبار جھلا جھلا کر گرمی میں مر رہے ہو۔ جاؤ اپنے سورگ میں۔ اور ہم غریبوں کو مرنے دو اس دنیا کی بھٹی میں...."

بھگوان نے کہا۔ " ابھی تو میں نہیں جا سکتا۔ ابھی تو میرا کام پورا نہیں ہوا ہے..."

" تو پیسے نکالو۔" میں نے جھگڑا کرتے ہوئے کہا اور واقعی میں راستی پر تھا۔ اگر میں دن بھر کسی دوسرے آدمی کے لئے کام کرتا تو کیا وہ مجھے دن میں دو وقت کے لئے روٹی بھی نہیں دیتا؟ اد ہنہ۔"

"پیسے تو میرے پاس نہیں! تمھیں معلوم ہے۔ بس یہ دو موم بتیاں میرے پاس ہیں۔"

"موم سے پیٹ بھرے گا! بھگوان جی ۔ تم بھی بھگوان تسم کیسی اول جلول ہانکتے ہو ؟"

" تو پھر میں کیا کروں ؟" بھگوان نے بالکل زچ ہو کر کہا ۔

"میں نہیں جانتا کیا کرو ، مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے .... سورگ سے پیسے منگاؤ ۔"

"وہ لوگ نہ بھیجیں گے ۔"

" کیوں نہیں بھیجیں گے ۔ اور کس کے حکم سے نہیں بھیجیں گے ۔"

"میرے ہی حکم سے نہیں بھیجیں گے ۔ تمام قواعد اور اصول میں نے ہی بنائے ہیں ۔ اب میں خود ہی کیسے انھیں توڑ سکتا ہوں ؟"

" مگر تم بڑے عجیب بھگوان ہو ۔ ساری بمبئی میں میں ہی تمھیں ملا تھا ، پریشان کرنے کے لئے :۔ وہ فلم سٹار بھاگ کا نوکر ہے سائیں چوہے شاہ کا بھگت ہے ۔ جب تک دن میں دو مرتبہ اس کے مزار پر نہ جائے فلم کی شوٹنگ نہیں کرتا ۔ چار لاکھ بلیک میں لیتا ہے پچیس ہزار کا کانٹریکٹ کرتا ہے ۔ اتنا بڑا عالی شان اس کا گیسٹ ہاؤس ہے ۔ آخر تم اُسی کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے ؟"

"ایک بار میں نے اس کے دل کو سونگھا تھا" بھگوان بولے
"مجھے اس کے دل میں کوئی خوشبو نہ ملی۔"

تو ہاپوڑ جی کا پوڑ جی والان والا کے ہاں چلے جاتے۔۔۔
سب جانتے ہیں کہ وہ مڈل ایسٹ سے سونا سمگل کرتا ہے ساٹھ روپیہ تولہ خریدتا ہے اور ایک سو پچیس میں یہاں بیچ دیتا ہے۔ ہر سال کروڑوں روپے کا سونا سمگل کرتا ہے، سرکار کے بڑے بڑے ٹھیکوں پر ہاتھ مارتا ہے، مگر بڑا خدا ترس نیک بہت بھگوان بھگت آدمی ہے، اسی سال اس نے دو مندر، دو مسجد، دو گرجا اور دو گوردوارے اپنی جیب سے چندہ دیکر تعمیر کرائے ہیں، تم اسی کے پاس جا سکتے تھے۔"

"میں نے اس کی آنکھیں دیکھی تھیں" بھگوان بولے۔ "مجھے اس کی آنکھوں میں شترم نظر نہیں آئی"

"تو تم اما پچکاری کے محل میں چلے جاتے۔۔۔ وہ بمبئی کی سب سے بڑی فحبہ ہے۔ پچاس قحبہ خانوں کی تو وہ اکیلی مالک ہے۔ ان مختلف فحبہ خانوں سے اسے ایک رات میں جتنی آمدنی

ہوتی ہے۔ وہ چیچا مل میں کام کرنے والے ڈیڑھ ہزار مزدوروں کی تیس دن کی تنخواہ سے بھی زیادہ ہوگی۔ وہ دن میں دو دفعہ پوجا پاٹھ کرتی ہے اور دو دو گھنٹے تمہارے چرنوں میں جھکی رہتی ہے۔"

"میں نے اس کے سینے میں جھانکا تھا" بھگوان بولے "وہاں مجھے کسی بچے کی لوری نہیں ملی ...."

"تو تم پیر کرامت علی کے پاس چلے جاتے .... وہ بمبئی کا سب سے بڑا صوفی ہے۔ ہر وقت مراقبہ میں پڑا رہتا ہے۔"

"وہ خیرات پر زندہ ہے۔"

"تو راموں دھوبی کے پاس چلے جاتے"

"وہ اپنی بیوی کو پیٹتا ہے"۔

"ساتھ والی کھولی کے کلرک کے پاس چلے جاتے۔"

"مجھے اس کی ناک پسند نہیں ہے!"

"بھگوان کی اس بات پر میں بے اختیار ہنس پڑا .... وہ بھی ہنس پڑے۔ تھوڑی دیر میں میرا سارا غصہ کافور ہوگیا۔ میں نے کہا.... "ہو تو تم بھگوان .... مگر تم میں مزاح کی حس بھی ہے"

"وہ بھگوان ہی کیا جو اپنی تخلیق پر ہنس نہ سکے"۔ بھگوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے"۔ میں نے تھوڑی دیر کے بعد سوچتے ہوئے کہا
..... "مگر ہنسنے سے پیٹ کی بھوک نہیں جاتی بلکہ اور بڑھ جاتی ہے"۔
" بھگوان نے کہا۔ "بھوک تو اب مجھے بھی لگ رہی ہے....."
"تمھیں بھی؟ وہ کیسے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"شاید تمھاری دنیا کا اثر ہو رہا ہے...."

میں نے سوچ سوچ کر کہا۔ "میرا ایک دوست ہے گھیٹو۔ ہے تو اعظم گڑھ کا پوربیا۔ دھوتی پہنتا ہے یہ لمبی چوٹی رکھتا ہے ... مگر ہے بڑے مزے کا آدمی۔ دن میں دودھ بیچتا ہے رات کو ٹھرّے کا دھندا کرتا ہے۔ اگر اس کے پاس چلیں تو کھانا تو وہ کھلائے گا اور شاید ایک "دو پیگ" بھی پلا دے... مگر ماہم تک پیدل چلنا پڑے گا"۔

"چلیں گے"۔

"اور اگر اس نے مجبور کیا تو دو ایک پیگ بھی پینا پڑے گا"۔

"پی لیں گے۔"

"اور اگر بدقسمتی سے پولیس کی دھاڑ آ گئی۔ اور تمہیں پکڑ لیا تو حوالات بھی جانا پڑے گا۔"

"چلے جائیں گے ...." بھگوان نے مکمل لاپروائی سے کہا

"اچھی طرح سے سوچ لو۔" میں نے کہا۔ "بعد میں مجھ کو کوسو گے تو نہیں۔ کہ کہاں لے گیا......؟ ... دوسرے دن اخبار کی یہ جلی سرخی ہو گی...... بھگوان حوالات میں:—— ذرا سوچو تو تمہیں شرم نہیں آئے گی۔

"شرم کیوں آنے لگی۔ یہ اتنے مندر جو بمبئی میں میری مورتی کو لوہے کی سلاخوں کے پیچھے بند رکھتے ہیں یہ حوالات نہیں ہیں تو اور کیا ہیں؟——" بھگوان نے ذرا ترش روئی سے کہا۔ میں چپ ہو گیا اور اٹھ کر باہر جانے کے لئے چپل پہننے لگا۔

ماہم کریک کا قریب جہاں سال میں دو مرتبہ دی گریٹ رائل

سرکس کا تماشا بیانہ لگا رہتا ہے۔ وہاں پر گھیٹو کا جھونپڑا تھا، اس
کا گھر تو مضافات میں گورے گاؤں کے قریب تھا۔ مگر مضافات
میں ٹھرّے کا دھندہ اکیا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس نے پولیس کی چوکی
کے بالکل قریب اس جھونپڑے میں ٹھرّے کا دھندا شروع کیا تھا۔
یعنی مسجد کے زیر سایہ خرابات کی بنا ڈالی تھی، یہاں اس کا دھندا
بڑے مزے کا چلتا تھا......

میں بہت دنوں کے بعد گھیٹو سے ملا، اس لئے وہ بیحد تپاک سے
مجھ سے ملا، اور اس آدمی میں یہ بھی بات تھی کہ یہ معلوم کر کے کہ میں بالکل
کڑکا ہوں، اس نے کسی طرح کا برا منہ نہیں بنایا۔ بلکہ کچھ کہے سنے بغیر
اُس نے ہم دونوں کے سامنے دو پیگ ٹھرّے کے رکھ دئے، چار مینار
کی ایک ڈبیا رکھ دی۔ مچھلی کے دو ٹکڑے تل کر رکھ دئے۔ جانے
کیسے اس نے بھگوان کے چہرہ کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ وہ بھی کڑکا
ہے اور جیب سے بالکل بچانک ہے...."

"مجا کرو!" گھیٹو مجھ سے بولا۔ "آج تم کو تین پیگ ٹھرّے پلا
دوں گا۔ پھر کھانا بھی کھلا دوں گا۔ پیسے بعد میں آجائیں گے، بھگوان

کی دیا ہے دودھ اور ٹھرے کا کام بہت اچھا چلتا ہے۔"

گھیٹو نے اتنا کہہ کر اپنی لمبی چوٹی کو گرہ دی اور جھک کر دیوار پر لگی ہوئی بھگوان کی تصویر کے سامنے ذرا سا سر جھکا دیا۔ پھر دوسری میزوں پر کام کرنے کو چلا گیا۔

جھونپڑا، دن بھر کام کرنے والے ماچھیوں، مزدوروں امیر گھروں کے نوکروں، پیشہ ور گداگروں، اور دس بجے کے بعد عورتوں کا دھندا کرنے والوں سے بھرا ہوا تھا، طرح طرح کی آوازیں طرح طرح کی زبانیں، طرح طرح کی گالیاں اور ان سب کے اوپر تمباکو اور مچھلی اور ٹھرّے کی پھیلی ہوئی بدبو انسانوں کے بہتے ہوئے پسینوں میں گھل کر ایک عجیب تعفن اور گھٹن پیدا کر رہی تھی......"

" انسان نے اپنے لئے جہنّم سے بھی زیادہ تکلیف دہ بستیاں آباد کی ہیں۔" بھگوان نے آہستہ سے کہا........ ان کے لہجے میں نفرت تھی.....

" تو یہ تو مانو گے کہ کہیں پر ہم نے تم کو مات دی ہے"۔

دادر پل کے بچے

"مانتا ہوں۔"

"تو پھر یہ ماننا پڑے گا... کہ اگر انسان دوسری طرف جھک گیا تو سورگ سے بھی خوبصورت بستیاں آباد کر سکے گا۔"

"ہُم .... بھگوان نے مسکرا کر کہا۔ "ٹھرّا پیئو...."

ایک دلال دوسرے دلال سے کہہ رہا تھا۔ "میں اس کو کمبھی دانتوں والی کے پاس لے گیا۔ جس نے ابھی ابھی اپنے دندان ساز سے نئے دانتوں کا سیٹ لگوایا ہے۔ مگر گاہک کو کمبھی پسند نہ آئی۔ بولا۔ مجھ کو جاپانی لڑکی دکھاؤ۔ میں اس کو یہاں لے آیا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اب کہاں لے جاتا.... میں اس کو یہاں گھبنو کے جھونپڑے میں لے آیا۔ اور اس کو ڈٹ کر ٹھرّا پلایا۔ جب وہ سالا ملکٹ بالکل دھت ہو گیا تو اس کو پھر کمبھی کے پاس لے گیا۔ اس ٹائم اس نے کمبھی کو نہیں پہچانا۔ بولا ہاں، ایسی ہی جاپانی لڑکی میں مانگتا تھا۔ سالا جاپانی کا بچہ.... جس لڑکی کے وہ گھنٹے پہلے دس روپے نہیں دیتا تھا۔ گھبنو بھیا

کاٹھرّا بی کر وہ اس کے پچاس دے گیا....."

"گھیٹو کا ٹھرّا اصل ہے، باقی سب نقل ہے.." گھیٹو خود بھی ایک پیگ چڑھاتے ہوئے بولا۔

گھیٹو کا ایک دوست چیٹا رام جو خود بھی گھیٹو کی طرح دودھ بیچتا تھا، بھرے ہوئے جھونپڑے کو رشک کی نظروں سے دیکھ کر بولا۔" تیرا دھندا تو بہت چل نکلا ہے بھیا، اب میں بھی شروع کرتا ہوں!"

" ناں! ناں!! گھیٹو اسے سمجھاتا ہوا بولا۔" دودھ کا دھندا ٹھرّے کے دھندے سے بہت اچھا ہے۔ دودھ میں جتنا پانی ملا دو گاہک کچھ نہیں کہے گا۔ لیکن ٹھرّے میں پانی کا ایک قطرہ بھی ڈال دو تو گاہک پھر کبھی نہیں آئے گا۔"

" گھیٹو جندہ باد!" ایک نوکر آہستہ سے بولا۔

" سب بھگوان کی دَیا ہے....." گھیٹو نے شیوجی مہاراج کی تصویر کو دیکھ کر پرنام کیا۔

گھیٹو بڑا دھرم آتما قسم کا آدمی تھا، اس نے جھونپڑے میں

چاروں طرف دیوی دیوتاؤں کی تصویریں رکھی تھی۔

"کدھر ہے بھگوان!" ایک مزدور زور سے ہنکارا۔

ادھر سامنے کی سلک مل میں آگ لگ گئی۔ مل ابھی تک چالو نہیں ہوئی دو مہینے سے بیکار پھرتا ہوں۔ میری گھر والی بیس برس سے رو ح مندر جاتی ہے۔ بھگوان کو کیا ہماری مِل ہی جلانی تھی"؟

"ارے بھگوان کو گالی مت دو"۔ گھیٹو زور سے چلا کر بولا

"اگر میرے جھونپڑے میں شراب پینی ہے تو گالی مت دو"۔

"کون پیتا ہے، آج کے بعد تمھارے جھونپڑے میں" وہ

وہ مزدور اپنا پیگ خالی کرتے ہوئے بولا۔" ہمارے دل اندر سے دکھتا ہے تو ہم بھگوان کو سناتا ہے...... بھگوان اگر ہمارا مل نہیں چلاتا۔ تو ہمارا سالے کا کیا بھیجا پھر بلا ہے۔ جو اس کو گالی دے گا۔"

مزدور غصے سے باہر چلا گیا۔ مگر وہ فضا میں فتیلہ سا لگا گیا اکدم بہت سے لوگ بول پڑے......

"ٹھیک تو کہتا ہے بیچارہ .... ہمارا ابھی چوری کا کارڈ

بار نہیں چلتا...."

"سندھی سیٹھ نے مجھ کو ایک مہینے کا نوٹس دیدیا، مکان خالی کردو۔ کدھر سے کریگا اور کدھر جا کے رہیگا......"

بائی بولتی ہے تم چور ہے۔ باندرے کی مارکیٹ میں ٹماٹر آٹھ آنے رتل ملتا ہے۔ تم بارہ آنے کیوں لاتا؟ تم چور ہے؟

میں تم سے کہتا ہوں، میں گئو کا مانس کھاؤں، جو تم سے جھوٹ بولوں، میں ایک پیسہ چوری نہیں کرتا پھر ہر روز چور کہلاتا ہوں"۔

سچ ہے اس اوپر والے کے گھر میں انصاف نہیں ہے....

میرا لڑکا دس دن سے بیمار تھا۔ سائیں چو ہے شاہ کی برکت سے اچھا ہوگیا۔ بھگوان تو بڑا اچھا ہے....

ارے اچھا ہے بہت اچھا ہے۔

نہیں ظالم ہے، سخت ظالم ہے۔

دو شرابیوں میں بحث ہونے لگی۔ دونوں موٹے موٹے ہاتھ پاؤں کے طاقت ور ماچھی تھے اور بھگوان کی صفات پر بحث کرنے سے زیادہ انھیں اپنی اپنی طاقت دکھانے کا زیادہ گھمنڈ تھا

میں کہتا ہوں وہ برا ہے ....."

میں کہتا ہوں وہ اچھا ہے ۔

برا ہے

اچھا ہے

دونوں ماچھی آمنے سامنے اٹھ کر ایک دوسرے سے ہاتا پائی کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ گھینو جلدی سے دونوں کے بیچ آ گیا۔ بولا۔ لڑائی مت کرو۔ تیسرے آدمی سے فیصلہ کرا لو"۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" دونوں ماچھی بولے۔ پھر ان دونوں کی نگاہیں ہم پر پڑیں، ہمارا ٹیبل ان کے بہت قریب تھا۔ وہ دونوں غور سے بھگوان کو گھورنے لگے۔ شاید انھیں بھگوان کا چہرہ میرے مقابلہ میں زیادہ سنجیدہ اور بھولا بھالا نظر آیا۔ میں کہہ نہیں سکتا۔ کیا بات تھی۔ بہر حال انھوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ اور وہ دونوں بھگوان کے پاس آکر بولے۔

"تم انصاف کرو۔ یہ بولتا ہے"۔ ایک ماچھی بولا "کہ بھگوان اچھا ہے۔ میں بولتا ہوں وہ ظالم ہے۔ تم بتاؤ ہم دونوں میں کون

ٹھیک ہے۔"

"کوئی بھی نہیں !" بھگوان نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

" کیسے ؟" وہ دونوں غصے میں بولے

"اس لئے بھگوان کہیں نہیں ہے"

" بھگوان نہیں رہیں !" وہ دونوں ایک ساتھ چیخ کر بولے "ارے سنتے ہو۔ یہ بولتا ہے۔ یہ سارا بلکٹ کہ بھگوان کہیں ہئی نہیں !"

رام رام

کفر بکتا ہے

بلاسس فیمس

"کیا بولا ہے تو کہ بھگوان نہیں ہے !" گھیٹو نے آکر بھگوان کو گلے سے پکڑ لیا۔ " اُسی کا کھاتا ہے اسی کا بیتیا ہے۔ اسی کا پہننا ہے اور اسی کو گالیاں دیتا ہے۔ ہمارے پاس آکر ادھار بیتیا ہے۔ اور ہمارے بھگوان سے انکار کرتا ہے . . . . . . "

گھیٹو نے ایک طمانچہ زور سے بھگوان کو لگایا۔

میں نے خوف سے تھرا کر کہا۔ "ارے ٹھہرو . . . . . ٹھہرو . . . . .

تم جانتے نہیں ہو یہ کون ہے ۔ ارے تم چھوڑ دو . . . ."

"ارے کیسے چھوڑ دیں اس کو ۔ بھگوان کی ہستی سے انکار کرتا ہے ۔ پھر ابھو تک دیں گے سالے کے . . . ۔ وہ دونوں ماچھی بھی بھگوان پر پل پڑے ۔

تھوڑی دیر میں پولیس کی سیٹیاں بجنے لگیں، میزیں الٹنے لگیں لوگ بھاگنے لگے تو میں بھی بھگوان کو دھکیل کر جھونپڑے کے باہر بھاگا اور سیدھا ماہم کریک میں جا کر غوطہ لگایا ۔ بھگوان کے چہرے پر اور جسم پر کئی نشان تھے ۔ اور جگہ جگہ سے خون بہہ رہا تھا ۔ میں پانی سے اس کا خون صاف کرنے لگا ۔

ماہم کریک میں گھسے ہوئے دور سے جھونپڑے کے ارد گرد دیکھ سکتے تھے ۔ وہ لوگ گھینو اور چند دوسرے لوگوں کو پکڑ کر لے جا رہے تھے ۔ تھوڑی دیر کے بعد چاروں طرف سناٹا ہو گیا ۔ تو ہم لوگ پانی سے نکلے ۔ اور گھر کی طرف چل دئے ۔

راستے میں میں نے بھگوان سے پوچھا ۔ "آخر تمہیں کیا سوجھی ۔ اپنی ہستی سے انکار کر بیٹھے ــــــ اور خواہ مخواہ مار کھائی . . . . .

تم نہیں جانتے ہو یہ ہندوستان ہے۔ یہاں قدم قدم پر مندر مسجد گوردوارا اور گرجا ملتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم لوگ بھگوان کے سب سے بڑے اپاسک اور پجاری ہیں۔ ہم لوگ اپنی بھگوان کے لئے اپنی جان تک دے سکتے ہیں!"

"اپنی جان تو دے نہیں سکتے! البتہ دوسروں کی جان ضرور لے سکتے ہیں!" بھگوان نے اپنے زخموں کو آہستہ سے ٹٹولتے ہوئے کہا "تم سمجھتے ہو کہ یہ میرے زخم ہیں، حالانکہ یہ سب تمہارے زخم ہیں۔ کانپور سے کلکتے تک اور جموّں سے جبل پور تک تم دھرم کرم کے نام پر جو کچھ کرتے رہتے ہو، وہ سب مجھ پر روشن ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا کبھی تم نے ان زخموں کو گنا بھی ہے۔ جو تم نے آج تک میرا نام لے لے دئیے ہیں؟"

دادر پُل کے بچّے

صبح دم جب میری آنکھ کھلی تو بھگوان غائب تھے۔ اکدم میرے دل میں خیال آیا کہ رات کے واقعہ سے خفا ہو کر چلے گئے مجھے دل میں افسوس بھی ہوا کہ آخر بتا کر چلے جاتے تو کیا ہرج ہوتا؟ میں کون سا ان کے ساتھ سورگ چلا جاتا؟ پھر خیال آیا ممکن ہے کہیں سیر کو نکل گئے ہوں، ابھی تو پَو پھٹی ہے سورج نکلنے تک انتظار کر لیں۔ میری نیند بھی پوری نہ ہوئی تھی، اس لئے میں کروٹ بدل کر پھر سو گیا سونے سے پہلے میں نے اتنا ضرور دیکھ لیا کہ دروازے کی کنڈی اندر سے بند ہے اور کھڑکی کی کوئی سلاخ بھی اندر سے غائب نہیں ہو

مگر اس بات پر مجھے چنداں تعجب نہ ہوا، بھگوان کے لئے یوں بند کمرے
سے غائب ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے بلکہ اکثر و بیشتر وہ
تمام اہم موقعوں پر جو انسان کی تاریخ میں پیش آئے ہیں غائب ہی
پائے جاتے ہیں چنانچہ میں نے اس امر پر چنداں تعجب نہ کیا اور
کروٹ بدل کر سو گیا۔ کھلی کھڑکی سے سورج کی روشنی اندر آ کر جب
میرے سوئے چہرے پر پڑنے لگی تو میں ہڑبڑا کر جاگا۔ جاگتے ہی میں
نے پہلی نگاہ اپنے بغل والی جگہ پر ڈالی جہاں بھگوان سوتے تھے
بھگوان بدستور غائب تھے اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی بھگوان
چلے گئے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے فوراً ادھر ادھر نگاہ ڈالی۔ کہ
کمرے میں کوئی چیز غائب تو نہیں ہے حالانکہ میرا یوں سوچنا انتہائی
کمینہ پن تھا۔ اور پھر میرے کمرے کا سامان بھی بیحد مختصر تھا، مگر پھر بھی جو
ہے غنیمت ہے اور آجکل بمبئی میں CONFIDENCE TRICK
کرنیوالوں کی کمی نہیں ہے۔ ممکن ہے کوئی چور آیا ہو اور بھگوان کا بھیس
بنا کر مجھے الّو بنا کر میرا سامان اٹھا کر چلتا بنے۔ اس لئے میں نے غور سے
کمرے کے چاروں طرف پہلے سامان پر سرسری سی نظر ڈالی اور میں سوائے

ایک چھتری کے کسی چیز کو غائب نہ پایا۔ تو پہلے لمحے کے لئے بیحد اطمینان ہوا اور دوسرے لمحے کے لئے بیحد شرمسار ہوا، کہ میں نے بھگوان کے لئے یوں سوچ لیا۔ تیسرے لمحے میں یہ سوال ابھر کر آیا۔ آخر بھگوان کو میری چھتری لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔

ابھی میں آنکھیں موندے بستر پر پڑے پڑے یہ سوچ رہا تھا کہ میرے قریب کسی کے کروٹ بدلنے کی آہٹ سی سنائی دی۔ میں نے چونک کر دیکھا بھگوان تھے اور میرے باجو کے بستر پر لیٹے تھے اور چھتری بھی اپنی جگہ جہاں موجود تھی، وہیں تھی اور کمرے کی کنڈی بھی اندر سے بند تھی۔ مجھے بھگوان کی اس حرکت پر بیحد غصہ آیا۔ چنانچہ میں نے انھیں جھنجھوڑ کر کہا۔

”کہاں گئے تھے؟“

”مس آشارانی نے بلایا تھا!“

”کون آشارانی؟ وہ جو مشہور فلم سٹار ہے؟“

”ہاں!“

”اسے بھگوان تک کیا کام پڑ گیا۔ بھگوان نے اسے سب

دے رکھا ہے۔ شہرت، دولت اور ایک احمق شوہر، عورت کو اور کیا چاہیئے؟ ــــ اس دنیا میں عورت جس چیز کی خواہش کر سکتی ہے وہ سب اسے میسر ہے۔ تم نے اس کے محل کے اندر تیرنے کا تالاب دیکھا..... !"

" ابھی وہیں سے نہا کر آرہا ہوں۔" بھگوان نے انتہائی معصوم انداز میں مسکرا کر کہا

" ہمارے سورگ میں بھی امرت کے تالاب ہیں اور ان میں کنول کے پھول تیرتے ہیں، مگر ایسا معطر پانی تو ہمارے ہاں کے کسی تالاب میں نہیں ہوتا اور چاروں طرف باہر اور اندر سنگ مرمر کی ٹائیلیں اور چاندی کا زینہ ... مزا آگیا۔"

" مگر اس نے بلایا کیوں تھا؟" میں نے بے چین ہو کر کہا۔

بھگوان جواب میں بچوں کی طرح شرمانے لگے، اور نظریں جھکانے لگے۔ لیکن جب میں نے کسی طرح ان کا پیچھا نہ چھوڑا، تو دبی زبان سے بولے .... " بھئی اسے مجھ سے پریم ہو گیا ہے!"

" ایک فلم سٹار کو تم سے پریم ہو گیا ہے؟" میں نے بستر سے

اٹھ کر کہا۔ "تمہارے ہوش ٹھکانے ہیں کہ نہیں!"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" بھگوان بھی اپنے بستر سے اٹھ بیٹھے۔ آخر ایک فلم اسٹار بھی انسان ہے۔ اُسے مجھ سے پریم کیوں نہیں ہو سکتا!

اور میں تو اسے ایک عرصہ سے دیکھ رہا ہوں۔ تمہیں نہیں معلوم ہے وہ مجھے کتنا چاہتی ہے۔ اُس نے اپنے گھر میں کرشن کی مورتی سونے کی بنوا رکھی ہے۔ اور روز صبح و شام وہ میرا بائی کا لباس پہن کر اس کے سامنے رقص کرتی ہے۔ طرح طرح سے مجھے رجھاتی ہے۔ اور کہتی ہے۔ اگر ایک بار تم مجھے اپنے درشن دیدو تو میں تمہارے چرن دھو دھو کر پیوں گی اور تم سے اس طرح لو لگاؤں گی کہ تم میرا بائی کو بھی بھول جاؤ گے۔"

"حرّافہ!" میں نے غصہ سے کہا

"وہ بالکل حرّافہ نہیں ہے!" بھگوان غصّے سے بولے "وہ بڑی سیدھی سادی عورت ہے۔ کتنے دن سے میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ آخر میں بھی تو ہر ایک کو ایسے ہی درشن نہیں دیتا ہوں۔ جب تک اچھی طرح پرکھ نہ لوں۔ آج صبح تو اس نے ایک خنجر نکال کر اپنے سینہ پر رکھ لیا۔ اور مجھ سے کہا۔ کہ اگر آج اسی وقت تم درشن نہ دو گے تو میں

اس خنجر کو اپنے کلیجے میں بھونک لوں گی لہٰذا میں نے اُسے درشن دیدئے۔"

"بڑی خاطر کی ہو گی اُس نے !"

"ہاں ! اس نے گنگا جل سے میرے پاؤں دھوئے۔ مجھے ریشمی کپڑے پہننے کو ۔۔۔ کھانے کو شدھ سوچھ سا توک بھوجن مجھے کھلایا۔ پھر میرے قدموں میں ایک سندر دبنا لے کر بیٹھ گئی، اور مجھے میٹھے میٹھے گیت سناتی رہی ... بہت اچھا وقت گذرا۔"

"آخر تم پر بھی ملم کا جادو چل ہی گیا۔"

"نہیں نہیں ۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے"۔ بھگوان مجھے سمجھاتے ہوئے بولے۔

"مگر وہ عورت ہے ہی دل کی بہت اچھی۔ میری تو بڑی بھگت ہے ... دل و جان سے مجھ سے پریم کرتی ہے، وہ تو مجھے آنے ہی نہیں دیتی تھی۔"

"پھر تم کیوں آئے ؟"

"تمھاری چھڑی جو لے گیا تھا۔"

"میری چھڑی کیوں لے گئے تھے ؟"

"بھئی اس کے گھر کے باہر دو کتے جو بند ھے رہتے ہیں۔ وہ بڑے خوفناک ہیں۔ اُن سے مجھے بڑا ڈر لگتا ہے اسی لئے۔ تمہاری چھتری لے گیا تھا۔ ممبئی کے کتوں کا کیا بھروسہ ؟ سنا ہے بھگوان سے بھی نہیں ڈرتے ؟"

"میں تم سے کہتا ہوں"۔ میں نے بھگوان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تم نے ابھی ممبئی نہیں دیکھی ہے۔ اور تم بیحد شریف اور معصوم ہو، بھگوان کے لئے اس چکر میں مت پڑو، یہاں بڑے بڑے آئے اور اپنا سب کچھ لٹا کر چلے گئے۔

"نہیں... نہیں... وہ ایسی نہیں ہے.." بھگوان نے بڑی سختی سے کہا۔

"کیا میں دلوں کا حال نہیں جانتا ؟"

میں نے بات ٹالنے کے لئے ان سے کہا، " اچھا یہ بتاؤ آج کہاں کہاں جانا ہے ؟ میں سوچ رہا تھا آج تمہیں جوہو پر لے چلوں !"

"جوہو پر ؟" بھگوان نے حیرت سے کہا۔

" اس نے بھی تو آج مجھے جوہو ہی پر بلایا ہے ..."

"کس نے ؟"

"آشارانی نے!"

"ٹھیک ہے تو پھر تمہیں میری ضرورت نہیں ہے۔ تم اُسی کے پاس جاؤ.."

"میرے دوست!" بھگوان نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"تم آشارانی کو بالکل غلط سمجھ رہے ہو، اس کا پریم مجھ سے سچا اور بے غرض ہے...."

میں نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ بھگوان کا ہاتھ جھٹک دیا، اور وہ شرمندہ سے ہو کر پرے بیٹھ گئے۔ اور میں ان کی طرف پیٹھ کر کے پھر بستر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آہٹ سی ہوئی کسی نے کنڈی کھولی۔ میں نے دیکھا، بھگوان دروازے پر کھڑے تھے، اُن کے ہاتھ میں میری چھڑی تھی، بولے میں تمہاری چھڑی لئے جا رہا ہوں۔ آج رات سیکنڈ شو میں وہ مجھے اپنی فلم دکھانے والی ہے۔ اب میں کل آؤں گا۔"

او نہہ کہہ کر میں نے غصہ سے منہ پھیر لیا۔

دوسرے روز صبح جو آئے تو میرے لئے، مٹھائی ناریل، پھول اور پھل وغیرہ لیتے آئے۔ بڑی مسرت سے بولے۔ ''یہ سب اس نے دئے ہیں اور اب یہ سب میں تمہیں دیتا ہوں۔ اور تم سے پھر کہتا ہوں کہ تم آشا رانی کو پہچاننے میں سخت غلطی کر رہے ہو۔ وہ مجھ سے سچّا پریم کرتی ہے شاید میرا بائی سے بھی زیادہ، وہ اب ایک لمحے کے لئے بھی مجھے اپنے آپ سے الگ نہیں کر سکتی، ہر وقت میرے چرنوں پر سر جھکائے پڑی رہتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اب مجھے بھی اس سے کچھ کچھ پریم ہو گیا ہے ...''

''تمہیں بھی؟'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''ہائے سالی نے پھانس لیا بیچارے کو.. ارے کیا کہتے ہو میرے بھگوان .. تمہیں اس فلم سٹار سے پریم ہو گیا ہے؟ تم جو ہر محبت اور ہر نفرت سے بالاتر ہو۔ اور بے نیاز ہو۔ تمہیں اس سے کیسے پریم ہو گیا ہے؟''

''تم نے اس کی صورت دیکھی، کتنی بھولی بھالی ہے؟ کتنی پیاری ہے، کل کے فلم فیئر میں اس کی تصویر دیکھی تھی؟'' بھگوان کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

''بیڑا غرق!''

اور اس کی پتلی پتلی باریک انگلیاں، جیسے تخلیق کی پہلی کاوش"
"بھگوان کی آنکھوں میں آشارانی کا خوبصورت تصور ناچنے
لگا..... " اور جب وہ میرے پریم میں بے سدھ ہو کر
ہاتھ میں کھڑتال لیکر ناچتی ہے تو کس قدر من موہنی معلوم ہوتی ہے"۔
"ستیاناس!"
"آج رات کو اس نے مجھے شکیلہ بانو بھوپالی کی قوالی سنانے
کا وعدہ کیا ہے!"
"گئے کام سے تم بھی!" میں نے مایوس لہجہ میں کہا۔
پھر ایک بار آخری کوشش کرتے ہوئے ان سے کہا
"آخر یہ سوچو کر تم سورگ سے یہاں کس کام کے لئے آئے تھے!"
"کیا بمبئی کے بچوں کو نہ دیکھو گے؟"
"لعنت بھیجو جی بچوں پر!"
"تمہیں اپنا فیصلہ بدلنے پر ڈر نہیں لگتا؟"
"جب پیار کیا تو ڈرنا کیا؟"
بھگوان گنگنانے لگے۔ میں سٹ پٹا کر اپنی کھولی سے باہر نکل گیا

میں نے انہیں جھنجھوڑ کر اٹھایا تو وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھے
"کیا ہوا؟" میں نے ان سے پوچھا "کیا آشا رانی نے گھر سے
نکال دیا۔"

"ارے نہیں بھائی!" بھگوان افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے بولے
"وہ تو بات ہی کچھ اور نکلی۔"

کیا ہوا۔ کیا آشا رانی کا پریم بدل گیا۔

"نہیں بھائی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ مگر کل رات وہ
میرے سامنے اتنا ناچی کہ ناچتے ناچتے میرے قدموں میں بال کھول کر
لپٹ گئی اور میرے پاؤں سے چمٹ کر روتے ہوئے بولی ——
"مجھ پر گھور سنکٹ آن پڑا ہے۔ بھگوان . . . . . . مجھے
اس سنکٹ سے بچاؤ . . . . . ."

"کیا سنکٹ تھا آشا رانی کا؟" میں نے بھگوان سے طنزاً
پوچھا۔

"شاید وہ اپنے احمق شوہر سے طلاق لینا چاہتی ہو گی۔"
"نہیں بھائی!" بھگوان نے افسردگی سے سر ہلا کر کہا۔

دادر پل کے بچے

"انکم ٹیکس کا کیس ہے !!!"

کھولی میں بہت دیر تک خاموشی رہی۔ بہت دیر تک بھگوان سر جھکائے افسوس سے اپنے ہاتھ ملتے رہے۔

آخر میں نے کہا۔ "تمہیں افسوس ہوگا کہ اس کی محبت بھی بے غرض نہ نکلی"۔

بھگوان نے کچھ کہا تو نہیں، لیکن افسوس سے سر ہلا دیا... ...

"مگر اس دنیا میں کون تم سے بے غرض محبت کرتا ہے۔ جس زندگی میں جس چیز کی کمی ہوتی ہے صرف اسے مانگنے کے لئے تمہارے پاس جاتا ہے .. ایک بیٹا، ایک گھر، ایک شوہر یا ایک روٹی... اور وہ جن کے پاس سب کچھ ہے وہ اس دنیا میں اپنا سورگ تعمیر کر کے اگلی دنیا کے

دادر پل کے بچے

سورگ میں اپنی جگہ ریزرو کرنے کے لئے تمھارے پاس جاتے ہیں ،
لاکھوں کی بلیک کے بعد ایک مندر، مسجد یا گرجا بنا دینا رشوت
نہیں ہے تو اور کیا ہے ؟ ان تمام لوگوں کے سامنے تمہاری حیثیت ایک
آئی سی، ایس افیسر یا ایک منسٹر سے زیادہ نہیں ہے ... وہ تمہیں نہیں
پوجتے، میرے بھولے بھگوان، وہ اپنی آرزو کو پوجتے ہیں، یا اپنے ڈر کو
پوجتے ہیں . . . . "

شاید میں غصہ میں کچھ اور بھی کہتا، مگر بھگوان کا بھولا نٹ سا چہرہ
دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ اور میں نے زور سے انھیں گلے سے لگا لیا گلے
سے لگتے ہی بھگوان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور ان کی سسکیوں میں ایسی
دھمک تھی جیسے یہ دھرتی آج ہی پھٹ جائے گی !!

دوسرے دن سے ہم دونوں پھر اپنے پرانے کام پر لگ گئے . . . .
مالی حالت بھی بے حد سقیم ہو چکی تھی ۔ سورگ سے مزید فارن اکسچینج

منگانے کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا ہم دونوں بچے بن کر لیکن ذرا بڑی عمر کے لڑکے بن کر چرنی گیٹ سٹیشن کے باہر کسی کام کی تلاش میں پہنچ گئے . . . . یہاں پر لڑکوں کی ایک ٹولی تھی جو سٹیشن سے اترنے والوں کیلئے ٹیکسی مہیا کرنے کا کام کرتی تھی، یہ لوگ بھاگ بھاگ کر ایروس سینما تک چلے جاتے تھے اور ادھر سے ایمبا ڈر ہوٹل تک چلے جاتے تھے اور خالی ٹیکسیوں کو گھیر کر گاہکوں کیلئے لاتے اور اس کام کے لئے انہیں دو آنے ملتے تھے۔ کبھی کوئی کمینہ گاہک ایک آنہ بھی دیتا تو لڑائی ہونے لگتی اور بہت سے لونڈے اکٹھے ہو کر شور مچانے لگتے۔ ہم نے بہتیری کوشش کی لیکن لڑکوں کی اس ٹولی نے ہمیں اپنے میں شامل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کے لیڈر نے ہم سے کہا۔

"ہم لوگ خود دن بھر کتوں کی طرح بھاگ بھاگ کر رات کے بارہ بجے تک آٹھ دس آنے پیدا کرتے ہیں۔ اس میں بڑی مشکل سے دن بھر کا چائے پانی سگرٹ اور ایک وقت کا کھانا ملتا ہے ٹیکسیاں کم ہیں اور کام کرنے والے زیادہ ہیں، اکثر گاہک تو خود ہی ٹیکسی ڈھونڈھ

لیتے ہیں۔ ایسے میں دھندا کیا خاک چلے گا۔ اب تم دو اور آ جاؤ گے، تو اور مصیبت بڑھ جاؤ گی"۔

وہاں سے مایوس ہو کر ہم لوگ سامنے کے فٹ پاتھ کے باجو میں بیٹھنے والے بوٹ پالش کرنیوالے چھوکروں کے پاس گئے۔ ان چھوکروں نے زنگدار لیش شرٹ پہن رکھے تھے کمر میں کس کر بیلٹ باندھی تھی اور کالی پتلونوں کو گھٹنوں سے اوپر چڑھا رکھا تھا۔ اور وہ پالش کرنے والے لکڑی کے ڈبے اپنے سامنے رکھے ہوئے اور ان میں رنگا رنگ کی پالش کی ڈبیاں سجائے ہوئے بڑے بانکے اور چھیلے نظر آ رہے تھے۔ ہم نے سوچا یہ کام بڑے مزے کا رہے گا۔"

بوٹ پالش کرنے والے چھوکرے جس دادا کے لئے کام کرتے تھے ہم اس سے ملے۔ وہ ہماری مصیبت سن کر بولا۔ "کام تو میں تم کو دے سکتا ہوں، مگر صبح آٹھ بجے یہاں سٹیشن پر آ جانا ہوگا اور رات کے بارہ بجے جانا ہوگا"۔

"وہ کیوں؟" بھگوان نے اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ "سرکاری رپٹ سے بھی زیادہ آٹھ گھنٹے کام تم نہیں کرا سکتے!"

دادر پُل کے بچے

"تو گورنمنٹ کے پاس جاؤ، میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

"یہ زمین بھگوان کی ہے، حکومت سرکار کی ہے۔ فٹ پاتھ پر کسی کی اجلہ ہ داری نہیں ہے"۔ بھگوان نے سختی سے کہا۔ "ہم بھوکے بچے ہیں۔ ہم یہاں پر اپنا لکڑی کا ڈبہ لیکر آئیں گے۔ اور پالش کریں گے۔ اور جو کمائیں گے اُسے خود کھائیں گے!"

"ایسا دھندا بمبئی میں نہیں چلتا مسٹر!" دادا تلخ لہجے میں بھگوان سے مخاطب ہو کر بولا، اس فٹ پاتھ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم دادا لوگ نے بانٹ لئے ہیں۔ ہم اس جگہ کا ہفتہ دیتے ہیں ہفتہ دیتے ہیں۔ تم ہماری جگہ پر کام کرو گے تو پکڑے جاؤ گے حوالات کی ہوا کھاؤ گے یہ بمبئی ہے۔ یہاں کام کرنا ہے تو ہمارے انڈر کام کرنا ہوگا۔ میں تم کو ایک پتلون کالی دوں گا، دو بش شرٹ دوں گا، دو ٹیم کھانا دوں گا۔ دو ٹیم چائے سپلائی کروں گا۔ پالش کا تختہ اور ڈبہ اور ڈبیاں سب میں دوں گا، تم کو کھالی پالش کرنے کا ہے اور ایک روپیہ روج مجھ سے لے جانے کا ہے۔ باقی سب کمائی پہ ہمارا حق ہے، پھر رات کو جب پالش کا کام ختم ہو جائیگا

تو لڑکیوں کی سپلائی کا کام شروع ہوگا، وہ کام بھی تم کو کرنا پڑے گا
"تم بچوں سے لڑکیاں بھی سپلائی کرنے کا کام لیتے ہو؟" بھگوان نے
اچنبھے سے پوچھا۔
"مسٹر! تم کس شہر سے آئے ہو جو ایسے الٹے سیدھے سوال کر رہے
ہو؟ اس بمبئی میں جو مہنگائی ہے اس میں بچے اگر کھود سے
نہ کمائیں تو بھوکے مر جائیں۔ اس لئے وہ سب کام کرتے ہیں۔ اجازت لیجئے
سے لڑکیاں سپلائی کرنے تک ہر کام کرتے ہیں اور ایک کام کرنے کے
لئے دس بچے بھاگ کر ہمارے پاس آنے کو تیار ہیں۔ دس بچوں کو پولیس
پکڑ کر ریفارمیٹری میں بھیج دیتی ہے۔ تو بیس اور آجاتے ہیں۔ تم کو
معلوم نہیں ہے کتنی بیکاری ہے۔ اس جاگر پر۔ جانے تم کس شہر سے آئے ہو
اور یہ لڑکیاں سپلائی کرنیکا دھندا کیا برا ہے۔ بچے نہیں کریں گے تو کوئی
اور کرے گا، لیکن بچّوں سے کام لینے میں یہ فائدہ ہے کہ ان پر کوئی شبہہ
نہیں کر سکتا، وہ کسی گاہک سے بات کرلیں، کسی بلڈنگ میں گھس جائیں۔
کسی عورت کے ساتھ چلنے لگیں۔ پولیس والے کو کبھی اس پہ شبہہ نہیں ہو سکتا
اس لئے یہ کام تو بچوں کے لئے ہے ـــــ اچھا ہے۔ اکدم سیف ہے

اور پیسہ بھی اس میں اچھا ہے۔ ورنہ دن بھر بوٹ پالش کرکر کے کیا ملتا ہے
صرف ایک روپیہ؟ اور میرے لڑکے تو ایک روپیہ کا دن میں سینما
دیکھ لیتے ہیں۔ پھر؟ باقی پیچوں کے لئے روپیہ کدھر سے لائیں گے۔
اس لئے یہ لوگ شوق سے رات کو دوسرا دھندا کرتے ہیں اور اس
میں ان کو کبھی ایک روپیہ کبھی دو روپے کبھی پانچ روپے بھی بچ جاتے
ہیں۔ یہ تو دھندے دھندے پر منحصر ہے۔۔۔۔ تم دونوں مجھ کو شریف
بچے معلوم ہوتے ہو اور یہ (دادا نے بھگوان کی طرف اشارہ کرکے
کہا) چھوکرا تو نہایت بیدھا سادا اور معصوم معلوم ہوتا ہے، پر تو
اس کام کے لئے بہت ہی عمدہ رہے گا۔ دس برس تک پولیس اس کو نہیں
پہچان سکتی۔ کہ یہ لڑکیوں کا دھندا کرتا ہے۔ بولو۔ کام کرتے ہو؟"

میں نے بھگوان کی طرف دیکھا۔ بھگوان نے میری طرف دیکھا
آخر بھگوان نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، اور مجھے وہاں سے گھسیٹتے ہوئے بولا۔
"چلو۔ یہاں سے چلیں!"

میں نے کہا۔ "مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ کیوں نہ اس دادا کی بات
مان لیں"

دادر پل کے بچّے
''نہیں۔ نہیں۔۔ ''تم چلو اس وقت یہاں سے!''
بھگوان مجھے زبردستی وہاں سے کھینچ لائے۔۔

اب ہم لوگ میرین ڈرائیو پر چل رہے تھے۔ کبھی کبھی سمندر کی ایک زور دار اچھال آتی اور خوش گوار پھوار ہمارے چہروں پر بکھیر جاتی۔ ہم لوگ آہستہ آہستہ چوپاٹی کی طرف چل رہے تھے اور بھگوان مجھ سے کہہ رہے تھے ''بچّوں کو یہ گندہ کام نہ کرنا چاہئے۔ بچّے تو قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ان کے ضمیر کو داغدار کر دینا اس چھوٹی سی عمر میں ان کی پاک و صاف روحوں کو غلاظت سے ملوّث کر دینا کسی طرح اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ بچّوں کو تو سکول میں پڑھنا چاہئے۔ یہی تو عمر ہے ان کی شرافت سیکھنے کی۔ تہذیب پانے کی، علم حاصل کرنے کی۔۔۔۔ اور میں دیکھ

رہا ہوں کہ وہ ٹھرّا بیچ رہے ہیں، اور لڑکیاں سپلائی کرتے ہیں اور کتوں کی طرح ٹیکسیوں کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہیں ایک آنہ کے لئے ...... میں نے انھیں تو اس دنیا میں اس کام کے لئے تو نہیں پیدا کیا تھا... آخر کیا بمبئی میں کوئی سکول نہیں ہیں۔ کیا تم لوگوں کے بچے سکولوں میں نہیں پڑھتے، اچھے کپڑے نہیں پہنتے، کتابیں نہیں پڑھتے...... اپنے گورو سے زندگی کا سچا سبق نہیں سیکھتے؟ کہاں ہیں وہ بچے؟

میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا، "ایسے بچے بھی ہیں گو ان کی تعداد کم ہے، مگر ایسے بچے بھی ہیں۔ میں تمھیں آج ہی مالا بار ہل کے ماڈرن اسکول میں لے چلتا ہوں۔ مگر چلتے چلتے میں بہت تھک چکا ہوں اور بھوک پیاس سے نڈھال ہوتا جا رہا ہوں۔"

"ماڈرن سکول ہے کہاں؟" بھگوان نے مجھ سے پوچھا۔

"وہ سامنے ملبار ہل کی پہاڑی پر!" میں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ بھگوان کی نظر بیرین ڈرائیو کے پانیوں سے پھسلتی ہوئی اوپر ملبار ہل پر چلی گئی۔ انھوں نے مجھ سے کہا اپنی آنکھیں بند کرو۔"

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

دادر پل کے بچّے

دوسرے لمحے میں جب میں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو ہم دونوں نیچے ماڈرن اسکول کے دروازے پر تھے۔

دادر پل کے بچے

سکول کی بلڈنگ بڑی خوشنما تھی۔ دو منزلہ عمارت بڑے بڑے پتھروں کی بنی ہوئی تھی، جن پر گلابی رنگ کا وارنش چمک رہا تھا بڑی بڑی کھڑکیاں اور دروازے سفید رنگ کے تھے۔ اور بلڈنگ کے چاروں طرف وسیع برآمدوں کے باہر ہری ہری گھاس کے لان تھے، جن پر صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے بچے خوش رنگ پھولوں کی طرح کھلے ہوئے نظر آتے تھے...

"یہ ہوا نا سکول! ــــــ اس کو کہتے ہیں اسکول!"

پھر بھگوان نے ایک چپراسی کو روک کر پوچھا۔ "تمھارے

پرنسپل کدھر ہے؟"

چپراسی نے بڑی نخوت سے ہم دونوں لونڈوں کو دیکھا۔ ہمارے میلے کچیلے لباس سے اندازہ لگاکر بولا۔" اگر تم وارنش کمپنی سے بل لیکے آئے ہو تو سیدھے اکاؤنٹنٹ کے پاس جاؤ!"

بھگوان نے بڑی مضبوطی سے کہا۔" نہیں ہم وارنش کمپنی کی طرف سے نہیں آئے ہیں۔ ہمیں پرنسپل صاحب سے ملنا ہے۔"

چپراسی نے پرنسپل کے کمرے کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بڑا صاحب ادھر بیٹھتا ہے۔"

جس دروازے کی طرف اس نے اشارہ کیا۔ اس کے اندر ہرے رنگ کے پردے لٹک رہے تھے اور باہر پیتل کی ایک تختی پر 'پرنسپل' لکھا تھا۔ دروازے کے دونوں طرف پھولوں کے گملے رکھے ہوئے تھے۔ اتفاق سے اس وقت پرنسپل کا چپراسی کہیں گیا ہوا تھا ہم نے موقع کو غنیمت سمجھا۔ اور سیدھے پرنسپل کے کمرے میں گھس گئے۔

پرنسپل گول مول چہرہ والا، درمیانے قد کا خوش اخلاق انسان

معلوم ہوتا تھا۔ جب وہ مسکراتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے منہ کے اندر سو کینڈل پاور کا بلب روشن ہو گیا ہو، اس کے چہرے سے شعاعیں سی پھوٹنے لگتی تھیں۔ وہ اس وقت اپنی میز پر جھکا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ آہٹ پاکر بغیر سر اونچا کیے اور ہماری طرف دیکھے بغیر اُس نے پوچھا، "کہیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"ہم دونوں بچے آپ کے سکول میں داخل ہونا چاہتے ہیں!"

بھگوان نے نہایت شیریں لہجے میں جواب دیا۔

پرنسپل نے سر اوپر اٹھایا۔ پھر اس کے چہرے پر وہی خوبصورت مسکراہٹ آئی، جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ مگر جوں ہی اس نے غور سے ہماری طرف دیکھا۔ اُس کی مسکراہٹ یکدم بجھ گئی۔ جیسے کسی نے سوئچ آف کر دیا ہو۔ اب اس کا چہرہ بڑا گمبھیر تھا۔

"میونسپل کمیٹی کے سکول میں کوشش کرو!" اُس نے نہایت بے دلی سے ہمیں صلاح دی۔۔۔

بھگوان بولے۔ "مگر ہمیں تو یہی سکول پسند ہے۔"

"کون سی کلاس میں داخلہ چاہتے ہو؟" پرنسپل نے پوچھا۔

"پانچویں میں!"

"پانچویں میں تو اگلے چار سال کیلئے سیٹیں ریزرو ہو چکی ہیں!"

"یہ سکول ہے یا ریل گاڑی کا ڈبہ ہے؟" میں نے کہا۔

پرنسپل حالانکہ ہندوستانی تھا مگر اس وقت وہ بالکل غیر ملکیوں کی طرح اپنے نتنانے بہترین انگریزی طریقے سے ہلاکر بولا، "اور ہم یہاں باہر کے صرف ان لڑکوں کو لیتے ہیں جو سالانہ امتحان میں فرسٹ کلاس لیتے ہیں!"

ہُم...... بھگوان نے کہا"

"تمھاری کون سی کلاس ہے!" پرنسپل سے بھگوان نے پوچھا۔

میں نے کہا: "ان کی بات کیا کرتے ہو؟ یہ تو ہمیشہ اور ہر جگہ فرسٹ کلاس فرسٹ آتے رہے ہیں!"

تبسم روشن ہو گیا.... وہ ایک فارم نکالتے ہوئے بولا۔

"تمھارے باپ کا کیا نام ہے اور وہ کیا کرتے ہیں!"

"میرا نہ کوئی باپ ہے نہ ماں!" بھگوان نے جواب دیا۔

"تو پھر تم اپنی تعلیم کیسے جاری رکھ سکو گے؟" پرنسپل نے

حیرت سے پوچھا۔

"کیا فرسٹ کلاس فرسٹ لڑکے کو وظیفہ نہیں ملے گا؟" بھگوان نے پوچھا۔

"وظیفہ تو ملے گا۔ پندرہ روپے ماہانہ، مگر اس سے کیا ہوگا؟"

"میں پندرہ روپے ہی میں گذارہ کر لوں گا،" بھگوان نے جواب دیا۔

"پندرہ روپے تو ہمارے بچوں کے دھوبی کا خرچ ہے!" پرنسپل نے مسکرا کر کہا، "سب ملا کر ایک بچے پر ڈھائی سو روپے خرچ ہوتے ہیں....."

"ایک بچے پر ڈھائی سو روپے خرچ کرنے والے لوگ بمبئی میں کتنے ہوں گے؟" بھگوان نے پوچھا۔

"چند ہزار تو ضرور ہوں گے، اس لاکھوں کی آبادی میں!" پرنسپل نے بھگوان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تو باقی لاکھوں کے بچے کہاں پڑھتے ہوں گے؟"

"ان کے لئے دوسرے سکول ہیں"۔

"مگر وہ اتنے اچھے تو نہیں ہیں؟" اور جو اچھے سکول میں پڑھنا چاہے، ایک ایسے ہی عمدہ اور خوبصورت سکول میں جیسا کہ یہ ہے وہ بچہ کیا کرے؟"

"وہ اپنے لئے امیر ماں باپ لائے کہیں سے!

پرنسپل نے ذرا

چڑ کر کہا۔

"میرے پاس بحث کرنے کے لئے زیادہ وقت نہیں ہے.... آپ لوگ جائیے...."

ہم لوگ وہاں سے چلے آئے مگر بھگوان کو تسلی نہیں ہوئی۔

وہ چلتے چلتے ایک کلاس میں گھس گئے۔ اور میرے منع کرنے کے باوجود گھس گئے۔ اور پچھلی بنچ پر جا بیٹھے۔ چند لڑکوں نے ہماری طرف حیرت سے بھی دیکھا۔ مگر ٹیچر کا لیکچر اس وقت زوروں پر تھا۔ اس لئے وہ کچھ بول نہ سکے۔

ٹیچر نپولین بوناپارٹ پر لیکچر دے رہا تھا۔

"نپولین بوناپارٹ بہت بڑا انسان تھا۔"

بھگوان نے فوراً پوچھا۔ "وہ کیوں بہت بڑا انسان تھا"۔

"وہ فاتح یورپ تھا" ٹیچر بولا

"کیا اُس نے اکیلے یورپ فتح کر لیا تھا؟" بھگوان نے پوچھا

"کیا اس کی مدد کیلئے لاکھوں سپاہی نہ ہوتے تھے، ہاں اگر وہ سپاہیوں کی مدد کے بغیر یورپ تو کیا یورپ کا ایک شہر بھی فتح کر لیتا تو میں اس کو بڑا مان لیتا"۔

"وہ اپنے وقت کا بہترین جنگی کمانڈر تھا!"

"جنگ لڑنے میں کیا بڑائی ہے! جنگ میں ہزاروں آدمی مارے جاتے ہیں، اگر ایک آدمی کا قاتل بڑا انسان ہے تو لاکھوں انسانوں کی جان لینے والا بڑا آدمی کیسے ہو سکتا ہے!"

ٹیچر نے ذرا غور سے دیکھ کر کہا۔ "تم کون ہو! تم تو مجھے اس کلاس کے لڑکے نہیں معلوم ہوتے، تم نے تو سکول کا ڈریس بھی نہیں پہن رکھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ گٹ آؤٹ"۔

بھگوان ہنستے ہوئے فوراً باہر بھاگے۔ ٹیچر ان کی باتوں سے بیحد سٹ پٹا گیا تھا!"

ایک برآمدے کے باہر چند لڑکے والی بال کھیل رہے تھے۔ ہم لوگ بھی ان میں جا گھسے۔ گیند کو بھگوان نے جاتے ہی پکڑ لیا اور مسکرا کر بولے۔

"ہم بھی کھیلیں گے!"

"تم کون ہو؟ ہمارے سکول کے بچے تو نہیں ہو؟"

"ارے اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ تم بھی بچے! ہم بھی بچے۔ مل کر کھیلیں گے۔۔" بھگوان نے گیند نچاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ ہم تمھارے ساتھ نہیں کھیلیں گے!" ہماری گیند واپس کرو۔۔۔ ہم تمھارے ساتھ نہیں کھیلیں گے؟"

"کیوں نہیں کھیلو گے؟ بھائی دو گھڑی کھیل لو، ہمارا جی خوش ہو جائے گا، تمھارا کیا بگڑ جائے گا۔۔۔۔" بھگوان منّت کرتے ہوئے بولے۔

"لاؤ ہماری گیند" بہت سے لڑکے اب ہمارے گرد گھیرا ڈالے ہوئے بولے۔

"گندے، غلیظ، گلیوں کے کتّے۔۔ جانے کہاں سے ہمارے

دادر پل کے بچے

سکول میں آ گھسے ہیں ..... ایک لڑکا غصہ سے بولا۔

ایک دوسرا لڑکا باکسنگ کرتا ہوا آگے بڑھا اور اُس نے بھگوان کے جبڑے پر ٹیک دیا۔ اُس کے آگے میں کچھ نہ دیکھ سکا۔ کیونکہ دوسرا گھونسہ میری ناک پر تھا... اور میری آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے تھے۔

شام کو جب میں اور بھگوان اپنی سوجی ہوئی ناکیں لئے اور زخمی ہاتھ پاؤں پھیلاتے ہوئے کھولی کی طرف آ رہے تھے تو بھگوان نے بڑی حقارت سے میری طرف دیکھ کر کہا

"چھ ؟ کیسا شہر ہے تمہارا ؟ جہاں بچے بچوں سے نفرت کرتے ہیں!"

دادر پُل کے بچّے

میری کھولی میں لیٹے لیٹے بھگوان نے مجھ سے پوچھا۔ "سو تے کیوں نہیں ہو؟"

"نیند نہیں آتی"۔

"کیوں نہیں آتی"؟

"بھوک لگی ہے!"

"تو تندوری مرغ کھاؤ۔ پلاؤ کھاؤ، بریانی کھاؤ، چکن چاپ کھاؤ کس نے منع کیا ہے؟" بھگوان مسکراتے ہوئے بولے....

"بمبئی میں سینکڑوں ریستوران ہیں جہاں سب کچھ ملتا ہے!"

"مگر بنا پیسے کے کچھ نہیں ملتا ہے تیری دنیا میں! تو بتا پھر ہم کیا کھائیں . . . ." میں نے جل کر پوچھا

"تو ہوا کھاؤ، میں نے ہوا سب کے لئے مفت کر دی ہے!"

بھگوان ہنس کر بولے . . . .

"ٹھیک ہے" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "آج رات ہوا ہی کھائیں گے۔ چلو میرے ساتھ!"

"نہیں، مجھے نیند آرہی ہے"

"اور مجھے نہیں آرہی ہے، اس لئے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا"

"کہاں؟"

"ہوا کھانے . . . . اٹھ چلو . . . ." میں نے بھگوان کو چٹائی سے گھسیٹ کر کھڑا کر دیا۔

"سونے دو مجھے!"

"جب تک مجھے کھانا نہیں ملے گا تمہیں نہیں سونے دوں گا"
میں نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

دادر پل کے بچّے

بھگوان میرے ساتھ کھولی کے باہر چل دئے . . . رات کے گیارہ بجے چکے تھے ۔ تو بھی ہوا گرم اور گھٹن والی تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسا حلق کے اندر جاکر گلا گھونٹ سی ہو ۔ عجب کڑوی، کسیلی، بدبودار دھوئیں والی ہوا تھی ۔

"اس کو تم ہوا کہتے ہو!" میں نے بھگوان سے پوچھا

مگر بھگوان تو اب بچے بن چکے تھے .. اُن کے چہرے پر وہی خوبصورت معصوم مسکراہٹ تھی، آنکھیں آدھی نیند اور آدھی جاگتے کی کیفیت لئے ہوئے، قدموں میں لغزش، جیسے بچّہ چلتے چلتے سو جائے . . . .
میں نے بھگوان کو اچھی طرح سے جھنجھوڑا ۔ "وہ دیکھو!"

"کیا، کہاں ؟" بھگوان نے گھبرا کر پوچھا

ہم لوگ چلتے چلتے اب تلک برج کے نیچے آپہنچے تھے ۔ جہاں سناٹا تھا ۔ اور سڑک سنسان تھی ۔ اور رستی گلیاں ویران اور سونی، اور اندھیری تھیں، پل کے نیچے بڑا اندھیرا تھا ۔ سامنے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے پڑے ریلوے یارڈ کا جنگلا تھا ۔ جس کے پرے ریل کی پٹڑیاں چمک رہی تھیں ۔ کہیں کہیں پر سڑک کے درختوں کے درمیان بجلی کے قمقمے

روشنی پھیلانے کی ناکام سی کوشش کر رہے تھے، اس سناٹے میں پل کے درمیانی پائے پر دس گیارہ برس کا ایک دبلا پتلا لڑکا بیٹھا بڑے اطمینان سے کاغذ کی ایک بڑی پوٹلی میں بھیل پوری رکھے کھا رہا تھا۔

"وہ دیکھو۔ وہ لڑکا اکیلا بھیل پوری کھا رہا ہے۔ چلو۔ اس کی بھیل پوری چھین لیں"۔ میں نے صلاح دی۔

"یہ تو زیادتی ہے"۔ بھگوان انکار کرتے ہوئے بولے

"زیادتی ہے تو ہوا کرے، آخر میں بھوکا ہوں، کیا کروں!" میں نے کہا۔

"زبردستی چھین لینا گناہ ہے۔ میں اس کی اجازت نہیں دیسکتا مگر ہم اس لڑکے سے درخواست کر سکتے ہیں!" بھگوان نے صلاح دی۔

جب ہم اس لڑکے کے قریب پہنچ گئے۔ تو میں ایک طرف کھڑا ہو گیا بھگوان دوسری طرف ... بیچ میں وہ لڑکا پل کے پائے پر بیٹھا بڑے اطمینان سے بھیل پوری کھاتا رہا۔ ہماری درخواست سن کر اس نے کاغذ کی پوٹلی ہمارے آگے بڑھا دی، بجلی کی سی تیزی سے۔ میرا ہاتھ آگے بڑھا۔ دوسرے لمحے میں بھیل پوری کا ایک بڑا نوالہ میرے منہ میں تھا۔

وہ لڑکا مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ "تم دونوں کئی دن کے فاقے سے معلوم ہوتے ہو!"

"اس میں کیا شبہہ ہے!" میں نے بھیل پوری کا نیمرالقمہ لیتے ہوئے جواب دیا۔

بھیل پوری کا ذائقہ کیسا کرکرا... کھٹا... میٹھا... نمکین اور سوں سوں کرتی ہوئی مرچوں والا تھا۔

مزا آگیا....

اس لڑکے نے پل کے پائے پر اپنی ٹانگیں ہلاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم دونوں میرے ساتھ کام کروگے تو میں تمہیں ایک روپیہ دوں گا۔"

"ایک روپیہ۔ پورا ایک روپیہ!" میں نے حیرت سے پوچھا

"ہاں!"

"کیا کام ہے وہ؟" بھگوان نے پوچھا۔

"بہت آسان کام ہے!—— لڑکے نے پل کے دائیں جانب دیکھتے ہوئے ایک نیم تاریک گلی کے موڑ کی طرف اشارہ کیا۔

"ادھر موڑ پر ابھی ایک پارسی باوا نکلے گا۔ اس کے سر پر کالی

ٹوپی ہوگی، بنچو سفید اچکن ہوگی اور ہاتھ میں بیگ ہوگا، ابھی وہ تھوڑی دیر میں موڑ سے ادھر آوے گا اور جب وہ اس پل کے نیچو پہنچے گا تم دونوں چھوکرا لوگ اس کے پاؤں پڑ جانا!"

"پاؤں پڑ جائیں؟ کیوں؟ بھگوان نے پوچھا۔

" ایسے ہی جھک کر بھیک مانگنا۔" بولنا پارسی باوا ہم کو ایک آنہ دو۔ صبح سے بھوکا ہے۔ بس دو آنہ دیدو.."

"پھر؟" میں نے پوچھا

" پھر کچھ نہیں ... وہ تم کو جیب سے دو آنہ نکال کے دے گا دے گا تو ٹھیک، نہیں دے گا تو بھی ٹھیک۔ تمہارا روپیہ کھرا ہے.."

"مگر تم دو آنہ کیلئے ہم کو ایک روپیہ کیوں دے گا؟" بھگوان نے پوچھا۔

لڑکا بولا۔ "تم کو جاستی بات کرنے کا نہیں ہے۔ سولہ آنے کمانا ہے تو جیسا ہم کہتا ہے۔ ویسا کرو۔ نہیں تو راستہ ناپو.."

"کر لیں کیا حرج ہے!" میں نے بھگوان سے کہا۔ "خالی ایک دفعہ پارسی باوا کے پاؤں چھونے سے ایک روپیہ ملتا ہے۔ تو کیا بُرا ہے"

تمھارے پاؤں دن رات چھوتے سے تو ایک دھیلا آج تک نہ ملا!"

"یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو" بھگوان بولے۔ "اور مجھے بھی یہ لڑکا بڑا دیالو معلوم ہوتا ہے جبھی دو آنہ کے بدلے میں سولہ آنے دے رہا ہے۔ بس اسی بچہ کی تلاش میں میں سورگ سے آیا تھا۔ تم سمجھتے ہو مجھے معلوم نہیں تھا کہ بمبئی میں بچوں کی کیا حالت ہے۔ مگر میں سمجھتا تھا اور ٹھیک سمجھتا تھا۔ کہ کہیں نہ کہیں پر پاپ اور پیاس کی اس اندھیری بستی میں مجھے ایک بچہ تو ایسا ملے گا، جو اس دن کی طرح معصوم ہو گا، جس دن میں نے یہ سرشٹی رچی تھی اور وہ بچہ مجھے آج مل گیا ...."

بھگوان نے محبت بھری نگاہوں سے اس دس سالہ لڑکے کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکا بھی جواب میں مسکرا کر فولاد کے جیبڈ پائے پر بیٹھا اپنی ٹانگیں ہلاتا ہوا نیم اندھیری گلی کی موڑ کی جانب دیکھتا رہا۔

مگر میرے دل میں شبہات ابھرنے لگے، لہٰذا میں نے اس لڑکے سے پھر پوچھا۔ "کیا بھروسہ ہے تمھارا؟ بعد میں تم بھی ایک روپیہ دو یا نہ دو! ہمیں کیا معلوم ہے تمھارے پاس ایک روپیہ ہے بھی کہ نہیں؟"

اس لڑکے نے جیب سے ایک ایک روپے کے دس نوٹ نکالے

اور انھیں ہماری آنکھوں کے سامنے جھلاتا ہوا بولا۔

"میرے پاس ایک نہیں پورے دس روپے ہیں۔ اس میں سے نو روپے میرے ہیں اور ایک روپیہ تمھارا ہے۔ اگر تم میرا کام کرو گے اور اگر تم کو کچھ عذر نہیں ہے۔ تو یہ لو آٹھ آنے .... ابھی سے لیکر اپنی جیب میں رکھو۔ باقی آٹھ آنے اُس وقت ملیں گے جب تم پارسی باوا کے پاؤں چھوؤ گے!"

جب میں نے آٹھ آنے جیب میں ڈال لئے۔ تو مجھے ذرا اطمینان ہوا ہم تینوں پل کے پائے پر سڑک کے کنارے اندھیرے میں بیٹھ کر اس نیم تاریک موڑ کی جانب دیکھنے لگے جدھر سے اس پارسی باوا کو آنا تھا۔۔

چند منٹ کے بعد بیچ بیچ وہی پارسی باوا کالی ٹوپی اور سفید اچکن پہنے ہوئے اور ہاتھ میں بیگ لئے ہوئے گلی کے موڑ سے نمودار ہوا۔ اُسے دیکھتے ہی اُس لڑکے نے میری کہنی کو ٹھوکا دے کر کہا۔ "وہی ہے ... وہی ہے ... جب وہ ہمارے قریب پہنچے، اس پل کے نیچے آئے تو فوراً آگے بڑھ کر اُس کے پاؤں پکڑ لینا ...."

میں نے کہا "بالکل فکر نہ کرو۔ ایسے پاؤں پکڑوں گا جب تک دو آنے نہ دے گا، سالے کا پاؤں نہ چھوڑوں گا۔"

"شاباش۔" لڑکے نے خوش ہو کر سرگوشی میں کہا۔

تھوڑی دیر میں وہ آدمی بالکل پل کے قریب پہنچ گیا۔ اور جب وہ ذرا اور قریب آیا تو میں چھلانگ مار کر فوراً آگے بڑھ گیا اور اس کے پاؤں پکڑ لئے۔

وہ پارسی باوا گھبرا کر بولا۔ "کیا ہے! کیا ہے؟"

"غریب یتیم ہوں، دو دن سے بھوکا ہوں دو آنے دے دو!"

"ہٹو ہٹو۔" اس پارسی نے ذرا غصے سے کہا۔

میں نے اور بھی مضبوطی سے اس کے پاؤں پکڑ لئے، اور بڑے مسکین لہجے میں کہا۔ "اوپر والے کا صدقہ صاحب جی... دو آنے کا سوال ہے..."

وہ پارسی جلدی سے جھک کر اپنا بیگ کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ اور اس میں سے ریزگاری ٹٹولنے لگا۔ میں اس کا پاؤں پکڑے گڑگڑائے جاتا تھا... صاحب جی... یتیم ہوں.. بھوکا ہوں

یکایک پارسی کے منہ سے ایک لمبی سی چیخ نکلی۔ اس کا بیگ اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اور وہ خون میں لت پت ہو کر وہیں فرش خاک پر لوٹنے لگا۔ دوسرے لمحے میں نے دیکھا کہ وہی دبلا پتلا لڑکا ایک لمبا چاقو اپنے ہاتھ میں لئے ریلوے یارڈ کے جنگلے کے اندر چھلانگ لگا کر ریلوے لائن سے گزرتا ہوا پرانی مال گاڑیوں کے ڈبوں کے نیچے غائب ہو گیا۔

اور یہ سب کچھ صرف دو لمحوں میں ہوا۔

بھگوان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔۔۔ انھوں نے جھک کر دیکھا تو پارسی باوا مر چکا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اُس کا بیگ بھی کھلا تھا۔ اور اُس میں سے وہ مٹھائی باہر جھانک رہی تھی۔ جو وہ اپنے بچّوں کے لئے گھر لے جا رہا تھا۔۔۔

دور سے کسی موٹر گاڑی کے آنے کی صدا سنائی دی۔ میں نے حیران اور ششدر کھڑے ہوئے بھگوان کو زور سے جھنجھوڑا

"چلو۔ بھاگو۔ ورنہ گرفتار ہو جاؤ گے۔۔۔"

"مگر یہ قتل۔۔۔ یہ لاش۔۔۔ یہ بے گناہ۔۔۔۔۔۔

اس کے نیچے .....''

''بھاگو بھاگو..'' میں بھگوان کو گھسیٹتے ہوئے کہنے لگا'' ورنہ وہ لوگ ہم دونوں کو گرفتار کرلیں گے.....''

چند منٹوں میں ہم نیم تاریک گلی سے بھاگتے ہوئے اور مختلف گلیوں اور سڑکوں سے دوڑتے ہوئے دور ٹرام ٹرمینس کے گول چکر میں پہنچ گئے۔ جہاں روشنی تھی اور قمقمے تھے اور رنگ و بو کے طوفان میں خوب [illegible] بچوں کی معصوم ادائیں تھیں، گاڑیوں، بسو [illegible] اور ٹرام کے پٹڑ پر ایک دو منزلہ ٹرام کے اندر [illegible] مسافر اپنے گھر جا رہے تھے

دادر پُل کے بچّے

پھر جب سب طرف اندھیرا چھا گیا اور ایک ایک کر کے ساری جاگتی ہوئی آنکھیں سو گئیں تو میں نے بھگوان سے کہا۔۔۔

"اگر تم اس قتل کو برداشت کر سکتے ہو۔ تو۔۔۔ تو۔۔۔ پھر تم بھگوان نہیں ہو۔۔۔۔؟"

"تو پھر میں کیا ہوں؟"

"یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ لیکن اس قتل کو اپنے ضمیر کے سامنے رکھ کر بتاؤ۔ کہ تم کیا ہو؟"

بھگوان سوچنے لگے۔ "کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس

ہوتا ہے۔ جیسے میں خود بھی نہیں جانتا۔ میں کیا ہوں۔ بہت بہت
عرصہ گذرا۔ کہ میں ایک آگ تھا۔ جو چٹانوں کو توڑ کر لاوے
کی طرح بہہ نکلی اور جنگلی انسانوں نے ڈر کر بھگوان سمجھ کر پوجا۔۔
پھر میں پانی تھا جو سمندر کی اچھال کے ساتھ پانی پر آیا اور لوگ
ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ پھر میں سورج تھا جو کڑکتے بادلوں کو چیر
کر نکلا اور ایک سنہری دھوپ کی طرح ساری دنیا پر چھا گیا۔۔۔
پھر میں ایک درخت تھا۔ ایک سانپ تھا۔۔۔ ایک چٹان تھا۔۔۔
میرے اتنے نام تھے، اتنی صورتیں تھیں، اتنے مقام تھے، جتنے
انسانی چہرے ہیں، ان کی خواہشیں ہیں اور ڈر ہیں۔ پھر انسان نے
ڈر پر فتح پالی اور میں بہت اونچا ہو گیا، اور یکایک میں بھی پیڑوں،
چٹانوں، پانیوں سے نکل بھاگا اور سورج سے بھی اوپر خلاء میں
چلا گیا۔۔۔۔ اب میرا نہ کوئی چہرہ تھا نہ مقام تھا، نہ صورت تھی
نہ نام تھا۔۔۔۔ میں صرف ایک تھا۔ زمینوں اور آسمانوں سے
بہت اونچا دور، اوپر اپنے سنگھاسن پر بیٹھا ہوا۔ لاکھوں زمینیں
میرے گرداب میں تھیں اور کروڑوں سورج ورطۂ حیرت میں تھے

کہ میں کیا ہوں کہ یکایک ایک چھوٹی سی گیند انسان کے چھوٹے
سے ہاتھوں نے خلاء میں اچھال دی اور وہ گیند زمین اور آسمان
کی پہنائیاں ناپتی ہوئی سورج اور چاند کا طواف کرتی ہوئی نظام
شمسی سے گذرتی ہوئی میرے تخت سے جا لگی اور میرا سنگاسن
ڈول گیا، اور میں سوچنے لگا کہ میں کیا ہوں۔۔۔؟"

"تو پھر تم نے کیا سوچا کہ تم کیا ہو۔ دادر کی ایک تنگ و
تاریک کھولی میں لیٹے ہوئے ایک غریب بھوکے انسان کے سامنے
آج تمھیں اپنی حقیقت کا اعتراف کرنا ہوگا۔ آج قاتل اور مقتول
دونوں کے چہرے تمہارے سامنے ہیں اور زندگی میں لاش سے
زیادہ پر اسرار شئے کوئی نہیں ہے ۔۔۔ بے گناہی کے رستے ہوئے
زخموں پر ہاتھ رکھ کر آج تو بتا دو کہ تم کیا ہو؟ تخیل کی آخری حد
ہو کہ پرواز کی معراج ہو۔ کہ ذہن کا آخری نقطہ ہو:۔

بھگوان نے سر جھکا کر انتہائی سادگی سے کہا، "میں آدمی ہوں!"

ان الفاظ کو سن لینے کے بعد بہت دیر تک خاموشی میرے کانوں میں گونجتی رہی، اور اندھیرے کا نور رہ رہ کر میرے سینے میں سسکتا رہا اور میں نے سوچا۔

"کیا واقعی بھگوان آدمی ہے ۔۔۔؟ آدمی؟ ــــ یعنی قاتل بھی اور مقتول بھی؟ بھونرا بھی اور پھول بھی؟ بڑھاپا بھی اور جوانی بھی؟ زندگی بھی اور قربانی بھی؟ دل بھی اور دوستی بھی؟ نفرت بھی اور دشمنی بھی؟ تہذیب بھی اور حیوان بھی، فرشتہ بھی اور شیطان بھی؟ ــــ آدمی؟

یعنی اتنا اونچا جتنا کہ آدمی اتنا ہی نیچا جتنا کہ آدمی ۔۔۔۔

دادر پل کے بچے

اتنا ہی تنگ، جتنا کہ آدمی اُتنا ہی بے کنار جتنا کہ آدمی، اتنا ہی سطحی جتنا کہ آدمی اُتنا ہی گہرا جتنا کہ آدمی۔۔؟ کیا یہ سچ ہے؟ کہ بھگوان نے انسان کو اپنے عکس سے بنایا کہ یہ سچ ہے کہ انسان نے اپنے عکس میں بھگوان کو دیکھا۔۔۔؟ آدمی۔۔؟ محض ایک آدمی؟۔۔ اور جس دن کائنات سے آدمی اٹھ گیا، اُس کا وجود ختم ہو گیا۔ تو کیا بھگوان بھی مر جائے گا؟۔۔۔۔ کیا نظام قدرت کے قوانین نہ ہوں گے۔ کیا روشنی اسی رفتار سے نہ دوڑے گی؟ کیا گیس خلاء میں نہ بھاگے گی۔۔۔۔

اور یہ جو مادے کی بنی ہوئی کائنات ہے، کہتے ہیں اس کے مدمقابل بالکل ایک دوسری کائنات ہے جو نہ مادے کی بنی ہوئی ہے کیا اس نہ مادے کی کائنات میں کوئی دانشور مخلوق بستی ہے! وہ نہ مادے کے لوگ کیسے ہوں گے، کیا ان کا بھگوان ہوگا۔ ہم سے بالکل الگ، مختلف متضاد بھگوان؟ ایک بھگوان نہ مادے کے عکس میں بنا ہو ANTI- MATTER

A GOD BUILT IN THE IMAGE OF ANTI-MATTER

اور پھر میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جب مادّہ اور نرمادہ آپس میں ٹکراتے ہیں تو پھر کچھ باقی نہیں بچتا . . . جب کچھ باقی نہیں بچتا تو پھر کیا ہوتا ہے ؛ بھگوان ؟ اس مکمل نفی کی حالت میں کیا ہوتا ہے ! بھگوان ؟ تم مجھے سب کچھ نہیں بتاتے ہو ؟ تم نے مجھے صرف اتنا بتایا ہے جتنا آدمی آج تک جان چکا ہے ۔ لیکن میں اس سے زیادہ جاننا چاہتا ہوں . . . اس سے کہیں زیادہ . . . آج تو کوئی نہیں دیکھ رہا ہے ۔ رات گہری اور سنسان ہے ، چاروں طرف سناٹا ہے اور کوئی نہیں سن رہا ہے آج تو مجھے آخری سچّائی بتا دو !

مگر چاروں طرف خاموشی تھی اور رات کا اندھیرا رک رک کر جھکیاں سی لیتا تھا ، جیسے نبض کائنات تھمتی جا رہی ہو ۔ بھگوان میرے قریب بالکل بے سدھ سوئے پڑے تھے ، اور ان کے چہرے پر ایسی مدھم معصوم سی مسکراہٹ تھی جیسے بچہ ماں کا دودھ پی کر خوابوں میں مسکراتا ہو . . . . !

دوسرے دن بھگوان نے کہا "میں آج سورگ چلا جا
تم مجھے ہوائی اڈے تک چھوڑ آؤ..."

میں نے ہنس کر کہا۔ "کیا ہوائی جہاز سے سورگ تک جاؤ گے
"نہیں!" بھگوان نے کہا۔ "جب ہوائی جہاز چلنے لگے گا
تو میں اچھل کر اس کے پروپلر پر بیٹھ جاؤں گا۔ اور پھر جب ہوائی
جہاز اوپر فضا میں اٹھ جائے گا، وہاں سے اوپر جانے کے لئے
مجھے کوئی دقت نہ ہوگی۔ فارن ایکسچینج کی دقت تو صرف زمین پر
محسوس ہوتی ہے..."

"کب جاؤ گے؟"

"شام تک چلا جاؤں گا، تب تک تم مجھے بچے دکھا دو"۔
"کیا بچوں سے ابھی تک جی نہیں بھرا؟"

"کیا بچوں سے ابھی تک جی نہیں بھرا؟"

"نہیں۔ ابھی تک وہ بچہ تو مجھے ملا ہی نہیں جسے دیکھنے میں آیا تھا... آج آخری دن ہے، شاید آج مل جائے!"

"وہ بچہ شاید ممبئی میں نہ ملے گا... وہ بچہ کہاں پر ہے؟ وہ بچہ کہاں پر ہے، میں تمہیں کیسے دکھا سکتا ہوں؟ تم بھی کیسے بھولے ہو بھگوان! پاکیزگی کا جو عکس تم اپنے دل میں لے کر آئے ہو وہ اگر ہمارے سماج میں ممکن نہیں ہے تو ہماری زندگی میں کہاں سے ملے گا تمہیں؟ ـ

"ایک ہی تو پاکیزگی ہے تمہارے پاس! تمہارا بچہ! ایک ہی تو معصوم سرمایہ ہوتا ہے، قوم کے پاس اس کا بچہ...... تم اُسے داغدار کیوں کرتے ہو؟"

"سرمائے کو لوگ سود پر نہیں لگاتے ہیں؟ کیا وہ اس سے منافع نہیں کماتے ہیں۔

پھر بچوں کو بھی اگر ہم نے ممبئی میں منافع کے لئے پیسے سے باندھ دیا ہے تو اس سے تمہیں حیرت کیوں ہوتی ہے؟ ـــ اپنے سورگ کو لوٹ

جاؤ، تمہیں وہ بچّہ یہاں نہ ملے گا!"

"ملے گا اور ضرور ملے گا، آج شام تک یہیں اسے ضرور ڈھونڈھ لوں گا۔

چلو اب نکلو بھی اس کھولی سے باہر!" بھگوان نے بے چین ہو کر کہا "شاید ہماری یہ غلطی تھی کہ ہم بڑی عمر کے بچے بنتے رہے ہیں آج ہم دونوں صرف چھ برس کے بچے بنیں گے۔"

"تمہارا جی چاہے تو دودھ پیتے بچے بن جاؤ، میں کہاں منع کرتا ہوں، مگر مجھے اتنا چھوٹا بچہ نہ بناؤ۔ کہ میں اپنی دو ٹانگوں سے چل کر واپس اپنی کھولی میں نہ آسکوں"۔ میں نے عرض کیا۔

"تو تمہیں آٹھ سال کا بچہ بنا دیتا ہوں، اور میں چھ سال کا بچّہ بن جاتا ہوں! ٹھیک ہے؟ بھگوان نے پوچھا۔

"جیسی تمہاری مرضی!" میں نے آہستہ سے کہا۔

دادر پل کے بچے

دن بھر ہم لوگ بمبئی کی گلیوں میں اور بازاروں میں سڑکوں اور چوکوں میں گھومتے رہے، گندی گلیوں کے پچھواڑوں، اور غلیظ موریوں والے مکانوں کے عقب میں بھی تاکتے رہے۔ مگر وہ بچہ ہمیں کہیں نہ ملا، آخر جب سورج ڈھلنے لگا اور بھوک اور پیاس نے ہمیں نڈھال کر دیا تو پوری بندر ڈاک یارڈ کے علاقے میں ہمیں کوئی سات برس کی عمر کا ایک لنگڑا بچہ مل گیا۔ جو غلیظ چیتھڑوں میں لپٹا ہوا اپنے ہاتھوں میں پیسے گنتا ہوا، خوشی خوشی چلا جا رہا تھا، اُس کے چہرے پر مسرت کی ایک ایسی چمک تھی، ایسی خوشگوار طمانیت تھی۔ ایسا مکمل سکون تھا کہ بھگوان اُسے دیکھتے ہی چونک گئے۔ اور فوراً لپک کر اس کے پاس پہنچے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" بھگوان نے اس سے پوچھا

"بھیکو!"

"کیا کام کرتے ہو؟"

"بھیک مانگتا ہوں"۔

"شرم نہیں آتی"۔

"شرم کس بات کی ؟ ___ یہ دیکھو۔" اس لنگڑے بچے نے پیسوں سے بھری ہوئی اپنی مٹھی دکھائی ..... پیسے ؟ .... پیسے ...... پیسے !!! ______ اس لنگڑے نے خوشی سے چلاّ کر کہا۔

بھگوان اکدم پیچھے ہٹ گئے، جیسے انھوں نے کسی سانپ یا بچھو کو دیکھ لیا ہو۔ پھر اپنا آپ سنبھال کر بولے ....

"تم کتنے بہن بھائی ہو ؟"

"ہم بیس بہن بھائی ہیں"۔

"سگے ؟"

"سگے ہی سمجھو۔ ہم بیس بچوں کا ایک ٹولہ ہے۔ اور ہم سب ایک ہی جگہ رہتے ہیں"۔

"اپنے باپ کے پاس ؟"

"نہیں اپنے دادا کے پاس ؟ وہ ہمارا بڑا خیال رکھتا ہے ہمیں دو وقت روٹی دیتا ہے، کپڑا دیتا ہے۔ رہنے کے لئے گھر

دبتا ہے۔ کبھی کبھی ہم لوگ سینما بھی دیکھ لیتے ہیں۔ ہم لوگ اس کے پاس بیحد خوش ہیں!"

بھگوان نے پر امید نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ پھر اُس لنگڑے بچے کی طرف دیکھ کر بولے ....

"کیا ہمیں بھی اپنے ٹولے میں شامل کرلو گے! ....."

"بھکاریوں کے ٹولے میں شامل ہو گے؟" میں نے احتجاج کرتے ہوئے ان سے کہا۔

"کیا مضائقہ ہے!" ایسے خوش مطمئن بچے میں نے آج تک بمبئی میں نہیں دیکھے، اور ایک نہیں اکٹھے بیس بچے ایسے اس بمبئی میں موجود ہیں۔ میں تو ضرور اس ٹولے میں شامل ہونا چاہوں گا ...."

"کہہ نہیں سکتا؟ دادا انہیں رکھے گا کہ نہیں؟ مگر میں تمہیں لے چلتا ہوں، ایک بات بتا دوں .. ... دادا بڑا سخت آدمی ہے۔ اس کی ہر بات تمہیں ماننی پڑے گی!"

"ٹھیک ہے! بھگوان نے اثبات میں سر ہلایا ....

میں نے بھگوان کو الگ لے جا کر بہت روکا، مگر وہ نہیں مانے

دادا گیر کے بچے

بلند رہے لہٰذا ہم دونوں اُس لنگڑے لڑکے کے ساتھ چل دئے۔

دیر تک وہ ہمیں ادھر ادھر پر پیچ گلیوں اور سڑکوں پر گھماتا رہا۔

آخر جب شام ہو گئی اور تاریکی بڑھ گئی تو وہ ہمیں ایک بڑے گندے نالے کے پاس جھونپڑیوں میں لے گیا۔ یہاں زنگ آلود ٹین کے گھر تھے۔ یا پرانے، کاٹھ اور کباڑ کی دیواریں تھیں، پھٹی ہوئی ترپالوں اور بوریوں کی چھتیں تھیں۔ دھواں اور تاریکی بد بو اور غلاظت اور کہیں کہیں چولھوں میں آگ بڈھی آنکھوں کی روشنی کی طرح کمزور اور جھلملاتی ہوئی۔ اُس لنگڑے نے ہمیں ان تنگ، و تاریک جھونپڑوں کے بیچ ایک بڑے سے آنگن میں لے جا کے کھڑا کر دیا جہاں قطار اندر قطار لولے، لنگڑے، اندھے، کانے بچے اور بچیاں بیٹھے ہوئے تھے، اور باری باری ایک سانولے رنگ کے گٹھے ہوئے بدن کے موٹے تازے آدمی کو دن بھر کا حساب دے رہے تھے۔ یہی آدمی غالباً سب کا دادا تھا۔ اُس کے پیچھے مگر اس کے بالکل قریب دو نوجوان غنڈے کھڑے تھے اور باز کی سی تیز نگاہوں سے بچوں کو دیکھ رہے تھے۔

دادر چل کے بچے

یکایک بابا نے ایک بچی کو زور سے تھپڑ مارا..... "آج دس پیسے کم کیوں لائی! ہیں؟"

بچی تھپڑ کھا کر دوسرے بچے پر جاگری۔ وہ دوسرا بچہ بھی وہیں زمین پر لڑھک گیا۔ دونوں بچے رونے لگے۔

"نکال باقی کے دس پیسے!"

"میرے پاس نہیں ہیں!" بچی نے سہم کر کہا۔

دادا نے آنکھ کے اشارے سے اپنے ایک نائب کو اشارہ کیا۔ اُس نے مار مار کر بچی سے دس پیسے اگلوالئے۔ جو اُس نے اپنے حلق میں چھپا رکھے تھے.....

پھر دوسرے بچے کانپتے ہوئے آگے بڑھنے لگے

ایک کونے میں چند فقیر عورتیں غلیظ چیتھڑے پہنے جلتی ہوئی آگ پر ایک بڑی دیگ چڑھائے ہوئے اُس میں ڈوئی چلا رہی تھیں اور مار پیٹ سے بے خبر بے حس اپنی باتوں میں مشغول تھیں۔

اب بھیکو کی باری آئی ہم دونوں سہمے سہمے اُس کے پیچھے پیچھے چلے آرہے تھے۔ دادا بھیکو کی کمائی دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

بولا۔ "شاباش اگر اگلے دو دن بھی اتنے ہی بچے لایا۔ تو تیسرے روز سینما دکھا دوں گا۔"

بھیکو خوش ہو کر بولا۔ "دادا اپنے دو دوست بھی لایا ہوں، یہ بھی ہمارے ٹولے میں شامل ہونا چاہتے ہیں!"

بھیکو نے ہاتھ سے پکڑ کر ہم دونوں کو دادا کے سامنے کر دیا دادا ہم دونوں کو دیر تک گھورتا رہا۔ اُس کی نگاہ بڑی خوفناک اور تیز تھی ـــــ تھوڑی دیر کے بعد کرخت لہجے میں بولا

"تم لوگوں کے ماں باپ کہاں ہیں؟"

"مر گئے!" میں نے آہستہ سے کہا۔ بھگوان خاموش رہے

"ہمارے ٹولے میں شامل ہو گے؟"

"جی ہاں!" بھگوان نے مسکین لہجے میں کہا۔

"جو بولوں گا وہ کرنا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے . . ." میں نے کہا،

"جیسا رکھوں گا ویسا رہنا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" بھگوان نے کہا۔

"بھیکو ان کو لے جاؤ۔ اور کھانا کھلاؤ، آج رات کو ان کو ٹولے میں شامل کیا جائے گا!"

جب ہم کھانا کھانے لگے، تو میں نے بھیکو سے پوچھا "آدھی رات کو کیا ہوگا؟"

"یہ آدھی رات کو معلوم ہوگا!" بھیکو نے مسکراتے ہوئے پراسرار لہجے میں کہا

آدھی رات کے قریب جب ہم دونوں کی آنکھیں نیند سے مندی جا رہی تھیں اور ہم ایک کونے میں غلیظ چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے ایک دوسرے سے رُک رُک کی سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے، تب بھیکو ہمارے پاس آیا، اور ہم دونوں کو جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔

"اٹھو دادا بلاتا ہے!"

"اب کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا

"تم دونوں کو ٹولے میں شامل کیا جائے گا!"

"کیسے؟" بھگوان نے پوچھا

"اس کی تو ٹانگ توڑی جائے گی! میری طرح!" بھیکو نے مسرت بھرے لہجے میں میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور دادا کہتا ہے کہ تم ——— (بھگوان کی طرف اشارہ کرکے) تم ——— بڑے بھولے اور معصوم دکھائی دیتے ہو، اس لئے تمہاری آنکھیں اندھی کی جائیں گی۔"

"میری ٹانگ توڑی جائے گی؟" میں نے چیخ کر کہا۔
"مجھے اندھا کیا جائے گا۔" بھگوان گھبرا کر چلائے۔"
کیوں؟"

اس لئے کہ لوگ صحت مند بچوں کو بھیک نہیں دیتے۔ ثابت و سالم بچوں پر کسی کو ترس نہیں آتا۔ ہاں اگر کسی بچے کی ٹانگ ٹوٹی ہو یا بازو غائب ہو، یا دھڑ پہ ناسور کا زخم ہو۔ یا آنکھیں اندھی ہوں تو لوگ ترس کھا کر۔ پیسے دے جاتے ہیں۔ ایسے بھکاری بچے بہت کم کماتے ہیں۔ اس لئے تم کو اندھا کیا جائے گا اور اسکی ٹانگ توڑی جائے گی اور پھر تم لوگ ہمارے ٹولے میں شامل ہو جاؤ گے!"

"ناں بھائی۔ میں باز آیا ایسے ٹولے میں شامل ہونے سے!"
بھگوان نے خوف سے اپنی دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے . . .
"بیوقوف مت بنو . . . ." بھیکو ہمیں سمجھاتے ہوئے
بولا . . .

"بس ذراسی تکلیف ہو گی۔ تھوڑا سا خون نکلے گا۔ چند
دن کے لئے بستر پر لیٹنا ہو گا۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر تم
لوگ بھی ہماری طرح ہر روز بہت سے پیسے کما سکو گے . . . چلو
. . . اب دیر نہ کرو دادا بلا رہا ہے!"
"نہیں۔ نہیں۔ ہم دادا کے پاس نہیں جائیں گے" بھگوان
نے احتجاج کرتے ہوئے کہا؛
"چلو یہاں سے بھاگیں!" میں نے بھگوان کا ہاتھ پکڑ کر
کہا۔

جب ہم بھاگنے لگے تو چاروں طرف ہلّہ مچ گیا۔ اندھیرے
میں پکڑو پکڑو کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اس بھاگ دوڑ میں میرا
ہاتھ بھگوان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں چھلانگ لگا کر اندھیرے

دادر محل کے بچے

میں راستہ ٹٹولتے ہوئے آنگن سے باہر نکل گیا، مگر بھگوان وہیں
گھیرے میں آ گئے

میری آدھی سانس اندر تھی اور آدھی سانس باہر، اور میں
ایک کونے میں دبکا ہوا پرانی لکڑی کے تختوں کی ٹوٹی ہوئی دیوار
کے ایک شگاف سے آنگن کے اندر دیکھنے لگا۔

بھگوان زور زور سے چلا رہے تھے اور انھیں دو
غنڈوں نے پکڑ رکھا تھا۔ اور انھیں وہ دونوں دادا کے پاس
لے جا رہے تھے جو ایک جلتے ہوئے الاؤ کے قریب کھڑا لوہے کی
ایک سلاخ کو سرخ کر رہا تھا۔
ان دونوں غنڈوں نے بھگوان کو اس الاؤ کے قریب لا کر
زمین پر لٹا دیا۔ ایک غنڈے نے بھگوان کے دونوں بازو پکڑ لئے

دوسرے غنڈے نے دونوں ٹانگیں۔ پھر دادا نے زور کا ایک قہقہہ لگایا اور آگ کی طرح جلتی ہوئی سرخ سلاخ کو الاؤ سے باہر نکالا۔

یکایک زور کی ایک چیخ ہوئی اور میں نے آنکھیں بند کرلیں عین اُسی وقت کرب اور درد کی شدت میں ڈوبی ہوئی ایک آواز میرے کانوں میں آئی

"میں نے دیکھ لیا...... میں نے دیکھ لیا.... !!"

لوگ کہتے ہیں یہ سب جھوٹ ہے۔ نہ بھگوان کبھی میرے پاس آئے۔ نہ میں نے ان سے کبھی باتیں کیں۔ نہ میں انھیں لیکر

کبھی بمبئی کی گلیوں میں گھوما۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ افترا ہے
کذب ہے۔ اور محض میرے تخیل کی ایجاد ہے ... میں نے
آج تک کبھی بھگوان کو نہیں دیکھا ہے!

اور باتوں کی تو میں قسم نہیں کھا سکتا۔ لیکن ایک بات کی
قسم ضرور کھا سکتا ہوں۔ میں نے بھگوان کو دیکھا ہے۔ ضرور دیکھا
ہے۔ ممکن ہے آپ نے بھی دیکھا ہو۔ مگر پہچانا نہ ہو!

زندگی میں آخری بار جب میں نے بھگوان کو دیکھا تو وہ
چھ سال کا ایک ناتواں بچہ تھا۔ اور اندھا تھا۔ اور شفق
کے ڈھلتے ہوئے سایوں میں دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے روتا
ہوا دادر پل پر کھڑا بھیک مانگ رہا تھا!